شاعرؔ صدیقی کی فکری جہتیں

اِمداداللہ

شاعر صدیقی کی فکری جہتیں

امداد اللہ

حسنِ ادب فیصل آباد
03217044014

ASIAN RESEARCH INDEX

Shaier Siddiqui ki Fikri Jehtain

By

Imdad Ullah

ARI ID: 1689956774273

جملہ حقوق بحقِ مصنف محفوظ ہیں

ضابطہ

نام کتاب:	شاعر صدیقی کی فکری جہتیں
تحقیق نگار:	امداداللہ
اہتمام:	حسنِ ادب فیصل آباد
سرورق:	ڈاکٹر عارف حسین عارفؔ
کمپوزنگ:	غیور عباس، شعور عباس
باراول:	جنوری 2023
تعداد	: 500
قیمت	: 500 روپے

OPEN ACCESS

CC BY

ECO FRIENDLY

Licensed under a Creative Commons Attribution 4.0 International License

انتساب

اپنے بڑے بھائی

ذاکر

کے نام

جن کے دستِ شفقت سے

میں اس قابل بنا

فہرست

- پیش لفظ ۵
- شاعر صدیقی (شخصیت وتصانیف) ۹
- شاعر صدیقی کی غزل گوئی ۲۷
- شاعر صدیقی کی نظم گوئی ۷۱
- شاعر صدیقی کی متفرق شاعری ۱۱۳
- شاعر صدیقی کا اختصاص ۱۶۳
- کتابیات ۱۶۷

❖ ❖ ❖ ❖ ❖ ❖ ❖ ❖

پیش لفظ

اُردو ادب سے رشتہ جوڑتے ہی میں نے گلزار ادب سے ایک ایسے پھول توڑنے کی کوشش کی ہے جس کے توڑنے سے دل و دماغ کی انگلیوں کو گھائل ہونے سے بچانا مشکل نہیں بلکہ ناممکن بھی تھا۔ یہ تجربہ میری زندگی کا پہلا اور مشکل تجربہ ثابت ہوا اور یہ احساس ہوا کہ کسی شخصیت پر قلم اُٹھانا اور کسی شخصیت کی فکر اور سوچ کے پوشیدہ گوشوں کی نقاب کشائی کرنا کس قدر کٹھن کام ہے۔ آج یہ کام محنت، لگن اور بالخصوص اللہ کے فضل و کرم سے اپنے پایہ تکمیل کو پہنچا جو کہ میرے لیے باعث افتخار و مسرت ہے۔ اس ضمن میں بڑی خوشی ہوتی ہے کہ محترم شاعرؔ صدیقی جیسے کہنہ مشق سخن ور کی فکر کے دریچوں میں جھانکنے کا موقع ملا اور ان کو قارئین کے سامنے لانے کی ایک کوشش کی۔

شاعرؔ صدیقی کا شمار دبستان کراچی کے ممتاز و معروف شعرا میں ہوتا ہے جن کا شعری سفر تقریباً سات دہائیوں پر پھیلا ہوا ہے۔ شاعرؔ صدیقی کا اصل نام عبدالرزاق خان ہے۔ آپ یکم فروری ۱۹۳۳ء کو کلکتہ میں عبدالغفار خان کے ہاں پیدا ہوئے جو ریلوے میں ملازم تھے۔ ابتدائی تعلیم کلکتہ سے حاصل کی تقسیم ہند کے وقت ہجرت کر کے مشرقی پاکستان کے شہر ڈھاکہ چلے آئے۔ اُنہوں نے شاعری کا باقاعدہ آغاز ۱۹۴۹ء میں کیا تھا جب وہ میٹرک کے طالب علم تھے۔ شاعرؔ صدیقی ایک ہمہ جہت شخصیت ہیں انھوں نے اُردو شاعری میں غزل، نظم، گیت، قطعہ، رباعی، اور دوہا جیسے مقبول اصناف سخن پر طبع آزمائی کی ہے جس میں اُن کی فکری بلندی فنی پختگی کے ساتھ نمایاں ہے۔ تحقیق کرتے وقت میرے سامنے بہت سارے موضوعات تھے لیکن شاعرؔ صدیقی کے کلام کو پڑھتے ہوئے صحیح معنوں میں، مَیں نے یہ بات محسوس کی کہ گویا یہ بھی میرے دل میں تھا۔ اگرچہ یہ کام مجھ جیسے طالب علم کے لیے مشکل بھی تھا اور باعث فخر بھی کیوں کہ اس کتاب میں پہلی دفعہ شاعرؔ صدیقی کے حالات زندگی مرتب کیے گئے ہیں اور اُن کی شاعری کا پانچ ابواب کے تحت موضوعاتی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ اس سے قبل بھی شاعرؔ صدیقی کے فکر و فن کے حوالے سے تھوڑا بہت کام ہو چکا ہے جو رنگ ادب ''شاعرؔ صدیقی نمبر'' کے علاوہ دیگر مختصر مضامین کی

صورت میں موجود ہے۔لیکن ان تنقیدی مضامین سے شاعر کے فکری زاویوں کی ہمہ گیری سے واقفیت حاصل کرنا ممکن نہیں۔

کتاب کا پہلا باب شاعرؔ صدیقی کی شخصیت اور سوانح پر مشتمل ہے۔جس میں خاندانی پس منظر سے لے کر عہد حاضر تک اُن کے حالات زندگی کا احاطہ کیا گیا ہے۔اس ضمن میں اُن کی ذاتی زندگی سے متعلق مواد کی فراہمی ایک مشکل مرحلہ تھا جس تک رسائی میسر دستاویزات کے توسط سے ممکن نہ تھی۔اس باب کی تکمیل کے سلسلے میں شاعرؔ صدیقی کے علاوہ ان کے عزیز و اقارب سے بھی رابطہ ہوا اگر چہ ان کی طرف سے ملنے والے مواد میں بنیادی معلومات کا فقدان ضرور تھا لیکن ایک نشان راہ کے طور پر یہ معلومات میرے لیے کافی کارآمد ثابت ہوئی جس کے ذریعے اصل منزل تک رسائی کسی قدر آسان ہوگئی اور یہ وقت طلب کام بھی اختتام کو پہنچا۔شاعرؔ صدیقی کے حالات زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے دو باتیں پیش نظر تھیں ایک یہ کہ اس سے پہلے آپ کی سوانح اور شخصیت اسی طرح مرتب شکل میں موجود نہیں تھی جس کی اشد ضرورت محسوس کی گئی کہ ان کی شخصیت اسی طرح مزید گوشہ نشینی سے باہر نکل کر ایک عام قاری کے سامنے رکھی جائے۔دوسری اہم بات یہ تھی کہ کسی بھی شاعر کے فکری رجحانات کو صحیح طریقے سے سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہوتا ہے کہ ان کا عہد اور زمانہ دیکھا جائے تا کہ اُن کے فکری زاویوں کو سمجھنے میں مشکلات نہ ہوں۔اس باب میں شاعرؔ صدیقی کا خاندانی پس منظر، پیدائش، تعلیم و تربیت، آغاز شاعری، آغاز ملازمت اولاد، سیرت و شخصیت، دوست و احباب اور اُن کی تصانیف کا تعارف زیر بحث لایا گیا ہے۔

دوسرے باب میں شاعرؔ صدیقی کی غزلوں کے فکری موضوعات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ان کی شاعری کا بیشتر حصہ غزلیات پر مشتمل ہے جن کی تعداد دو سو کے قریب۔یہ غزلیں فکر و فن کے اعتبار سے بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔شاعرؔ صدیقی کی غزلیہ شاعری کو پڑھتے ہوئے کہیں پر بھی فکری شکستگی کا احساس نہیں ہوتا ہے۔شاید یہ وجہ ہے جس کی بنیاد پر شاعرؔ صدیقی ایک کامیاب غزل گو مانے گئے ہیں۔ان کی غزلوں میں اگر ایک طرف فکر کی بلند پروازی اپنی ایک توانا صورت میں موجود ہے تو دوسری طرف یہ شاعری کے قدیم اور جدید رنگوں کا ایک حسین امتزاج ہے۔اُن کے ہاں جو مثبت رویہ ملتا ہے وہ حقیقت نگاری ہے جو محض غزلوں ہی تک محدود نہیں بلکہ سارے کلام پر محیط دکھائی دیتا ہے۔فکری اعتبار سے اُن کی

غزلوں میں درد وغم کی لہریں ،ہجرت کے آثار،انسانی عظمت کے ترانے، پراُمید رویہ، جمالیات کی رنگینیاں،عزم وانقلاب کا جذبہ اورفریب دنیا جیسے موضوعات اُن کی فکر کے ترجمان ہیں۔

اس کتاب کا تیسرا باب شاعرؔ صدیقی کی نظم نگاری کا فکری جائزہ ہے۔ یہ نظمیں اگر چہ تعداد کے لحاظ کم ہیں لیکن یہ اپنے موضوعات کے اعتبار بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔ان نظموں میں شاعر کی پروازِ فکر پوری توانائی کے ساتھ جلوہ گر ہے۔جس میں ان کے شعری سفر کے تین ادوار کا ایک واضح عکس دیکھا جاسکتا ہے۔ ہندو مسلم فسادات سے لے کر سقوط ڈھاکہ تک اور سقوط ڈھاکہ سے لے کر شہر کراچی کے دور حاضر تک کے ناگفتہ بہ حالات کے تذکرے اُن کے نظموں میں موجود ہیں۔جس میں انھوں نے اپنے تجربات مشاہدات،احساسات کو بڑی شدت کے ساتھ بیان کیے ہیں۔نظم کے ذریعے انھوں نے اپنے مافی الضمیر کو جس سلیقے سے بیان کرنے کی کوشش کی ہے یہ نظم لکھنے پر اُن کی عبور اور دسترس کی واضح دلیل ہے۔نظموں میں شاعر کی فکری ارتقا کیا وج کمال پر دکھائی دیتی ہے۔جو اُن کی دوراندیشی اور عصری شعور کا پتہ دیتی ہے ان نظموں میں سقوط ڈھاکہ کی روداد،مٹی سے والہانہ محبت کا جنون ،فلسفہ زندگی،حق گوئی اور سچائی کے گیت،اتحادالمسلمین کی فکر،شہر آشوب اور ماضی سے جڑے ہوئے یادوں کی کہانیاں موجود ہیں۔

چوتھا باب اس کتاب کا وسیع باب ہے جس میں شاعرؔ صدیقی کی متفرق شاعری کا فکری مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔متفرق شاعری میں حمد،نعت، رباعیات،قطعات، گیت اور دوہے شامل ہیں جو کثیر الجہت موضوعات پر مشتمل ہیں،حمد ونعت کے علاوہ رباعیات اور قطعات میں بھی حمدیہ اور نعتیہ موضوعات ملتے ہیں جو شاعر کے عشق حقیقی کے مظہر ہیں۔دوہوں میں اخلاقیات اور دیگر سماجی مسائل کے علاوہ شاعر کا رومانوی طرز فکر بھی نمایاں ہے۔کلیات میں گیت بھی بڑی تعداد میں موجود ہیں جن میں اکثر وہ گیت ہیں جو فلموں کے لیے لکھے گئے تھے۔ان گیتوں میں نسوانی اُمنگیں،طنز ومزاح کے نشتر اور اپنے وطن سے محبت کا والہانہ جذبہ محسوس کیا جاسکتا ہے۔کتاب کے آخری باب میں شاعرؔ صدیقی کی شخصیت اور شاعری کی روشنی میں اُن کا مقام ومرتبہ متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ادب کے ایک ادنی طالب علم ہونے کی حیثیت سے جہاں تک ممکن تھا میں نے اپنے فہم و ادراک کی روشنی میں اپنے نقطہ نظر کو پیش کرنے بلکہ سمندر کو کوزے میں بند کرنیکی کوشش کی ہے۔

شاعرؔ صدیقی کے شعر اور شخصیت کے حوالے سے میں اپنی اس چھوٹی سی کاوش کو سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف سمجھتا ہوں۔ اب میں کہاں تک اپنے اس تحقیقی کام میں کامیاب ہو چکا ہوں یہ فیصلہ قارئین بہتر کر سکتے ہیں۔ اس کام کی تکمیل کے سلسلے اپنے استاد محترم ڈاکٹر محمد الطاف یوسف زئی (صدر شعبۂ اُردو ہزارہ یونیورسٹی مانسہرہ) کا بے حد ممنون ہوں جن کی مفید آراء سے میری منزل میں وقتاً فوقتاً آسانیاں پیدا ہوتی گئیں۔ اس ضمن میں ڈاکٹر محمد اسماعیل (معلم اُردو گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج صوابی) کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے نہایت خلوص کے ساتھ اس کتاب کی اشاعت تک میرا ساتھ دیا اور اپنی دوستی کے حق کو ادا کرنے میں کوئی کسر نہیں چوکڑی۔ اُمید ہے میری یہ کوشش شاعرؔ صدیقی کی شاعری اور شخصیت پر مزید کام کرنے والوں کے لیے ایک مشعل راہ ثابت ہوگی۔

امداد اللہ

سوات

جنوری ۲۰۲۳

شاعرؔ صدیقی: شخصیت و تصانیف

خاندانی پس منظر

شاعرؔ صدیقی کے آباؤ اجداد کا تعلق افغانستان سے ہے۔ ان کے بزرگ دراصل سپہ گیری کے پیشے سے وابستہ تھے۔ جنہوں نے کسی زمانے میں ہجرت کر کے خیبر پختون خواہ چلے آئے اور پشاور میں اپنا کاروبار شروع کیا۔ اس کے بعد یہ خاندان پشاور سے دہلی منتقل ہوا اور وہاں سکونت اختیار کر لی بقول شاعرؔ صدیقی یہ غالباً نادر شاہ افشار کا زمانہ تھا۔ شاعرؔ صدیقی اپنے خاندانی پس منظر کے متعلق کچھ یوں لکھتے ہیں:

> ''ہمارا خاندان جو ہے یہ دراصل افغانستان سے تعلق رکھتا ہے۔ اس لیے ہم ذات کے پٹھان ہیں۔ اس کے بارے کچھ زیادہ علم اس لیے نہیں ہے کہ ہمارے بزرگوں نے اس پر زیادہ روشنی نہیں ڈالی۔ سنی سنائی جو بات تھی ہمارے خاندان میں بلکہ ہماری اپنی دادی کی زبانی تو وہ مجھے کچھ یاد ہے اور کچھ اس طرح یاد ہے کہ اس نے میری والدہ سے بعض گفتگو کی تھی زیادہ کہ ہمارا خاندان اس طرح کا تھا۔ تو وہاں سے پشاور یا سرحد کی طرف رخ کیا تو سرحد یا غالباً پشاور میں کچھ کاروبار کیا۔ پھر وہاں سے ہجرت کر کے وہ لوگ دہلی آئے۔ یہ غالباً نادر شاہ افشار کا زمانا تھا۔''(۱)

بیرونی حملہ آوروں کی وجہ سے جب دہلی کے شہر میں قتل غارت گری شروع ہوئی اور شہر اُجڑ گیا تو شاعرؔ صدیقی کے دادا فخر اللہ خان نے اپنے خاندان کے ہمراہ دہلی سے ہجرت کر کے لکھنو چلے آئے جہاں اُن کی وفات ہوئی۔ اس ضمن میں شاعر صدیقی لکھتے ہیں:

> ''جب دہلی میں قتل غارت گری شروع ہوئی تو میرے دادا فخر اللہ خان نے اپنے چھوٹے سی فیملی کو لے کر دہلی سے لکھنو ہجرت کی۔ جب لکھنو پہنچے تو کافی عرصہ تک لکھنو میں رہے۔''(۲)

فخر اللہ خان کی تین اولاد میں دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ شاعرؔ صدیقی کے والد عبدالغفار خان ان کے چھوٹے بیٹے تھے۔ فخر اللہ خان کے دونوں بیٹے (عبدالرحمان خان اور عبدالغفار خان) ایسٹرن ریلوے میں ملازم تھے جس کا ہیڈ کوارٹر بنگلہ دیش کے شہر کلکتہ میں واقع تھا۔ شاعرؔ صدیقی لکھتے ہیں:

''جہاں تک مجھے یاد ہے اُن کی دو اولاد تھی عبدالرحمان خان اور عبدلغفار خان جو میرے والد تھے۔ اس کے بعد ایک بہن تھی اُن کی۔ اس کا اصل نام تو پتہ نہیں لیکن سلونی کہہ کر پکارتے تھے اس کو۔'' (۳)

شاعرؔ صدیقی کے دادا کی وفات کے بعد اُن کی دادی لکھنو سے کلکتہ آئیں اور باقی زندگی کلکتہ ہی میں گزاری کلکتہ شہر میں اپنا کاروبار شروع کیا۔ یہاں اُنھوں نے تمام بچوں کو خوب پڑھایا اور بچوں کی تعلیم اور تربیت میں اہم کردار ادا کیا اس ضمن میں شاعرؔ صدیقی یوں لکھتے ہیں:

''ہماری دادی دو بچے اور ایک بیٹی کو لے کے وہاں سے اپنے خاندانی نوکر کے ساتھ کلکتے آئیں اور کلکتے میں انھوں نے نئی زندگی شروع کی اور کلکتے میں رہے اور کلکتے میں ہمارے دادی نے اپنا کچھ کاروبار کیا۔ جس میں خاندانی نوکر نے خوب ساتھ دیا اور اپنے بچوں کو پڑھایا لکھایا۔ شروع میں میرے والد کا کیا کام تھا پتہ نہیں لیکن برٹش کے دور میں انہوں نے ریلوے میں ملازمت کر لی۔ بلکہ دونوں بھائیوں یعنی میرے والد اور چچا نے ریلوے میں ملازمت اختیاری کر لی'' (۴)

شاعرؔ صدیقی کے والد عبدالغفار خان کی شادی کلکتہ کی رہائشی خاتون سیدہ فروزی بیگم سے ہوئی جو شاعرؔ صدیقی کی والدہ تھیں۔ سیدہ فروزی بیگم کچھ زیادہ تعلیم یافتہ نہ تھیں لیکن انھوں نے اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ شاعرؔ صدیقی اپنی والدہ سے بے انتہا محبت کرتے تھے یہی وجہ ہے کہ اُن کی شاعری میں ماں سے جدائی کا کرب محسوس کیا جا سکتا ہے۔

پیدائش

شاعرؔ صدیقی مغربی بنگال کے شہر کلکتہ میں یکم فروری ۱۹۳۳ء کو پیدا ہوئے (بمطابق میٹرک

سرٹیفکیٹ)۔اُن کا اصل نام عبدالرزاق ہے جبکہ شاعرؔ صدیقی اُن کا قلمی نام ہے۔اُن کے والد کا نام عبدالغفار خان اور والدہ کا نام فیروزہ خانم تھا۔جن کا تعلق چوں کہ لکھنو سے تھا لیکن تلاش معاش کے سلسلے میں کلکتہ ہجرت کر کے مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔اس حوالے سے شاعرؔ صدیقی اپنے ایک مضمون بعنوان ''حالات زندگی''میں لکھتے ہیں:

''میری کہانی میرے پیدائشی نا عبدالرزاق سے کچھ اس طرح شروع ہوتی ہے کہ میرے والد محترم عبدالغفار خان لکھنو کے رہنے والے تھے اور میری والدہ ماجدہ پٹنہ کی تھیں۔پیدائش بنگال کے شہر کلکتہ میں ہوئی۔ پہلی درگاہ مدرسہ عالیہ تھی۔''(۵)

شاعرؔ صدیقی ایک انٹرویو مزید کہتے ہیں:

''میرا اصل نام عبدالرزاق خان ہے اور میرے والد کا نام عبدالغفار خان ہے۔ہم ذات کے پٹھان ہیں۔صدیقی کا لاحقہ اتفاق سے میرے نام کے ساتھ جڑ گیا۔اور چوں کہ میری پہلی غزل ہی نے ہم عصر شعرا کو چونکا دیا تھا۔اس لیے صدیقی کا لاحقہ اتفاقاً جڑ گیا۔جواب تک قائم اور ایسا قائم ہیکہ اس کو اپنے نام سے الگ بھی نہیں کرسکتا''(۶)

بقول پروفیسر ہارون الرشید:

''عبدالرزاق خان نام اور قلمی نام شاعرؔ صدیقی،۱۹۳۳ء میں (میٹرک کے سرٹیفکیٹ کے مطابق) کلکتہ (مغربی بنگال) میں پیدا ہوئے۔یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ ان کے والد عبدالغفار خان لکھنو کے رہنے والے تھے۔ملازمت کے سلسلے میں کلکتہ آئے اور وہیں مستقل رہائش اختیار کر لی۔''(۷)

شاعرؔ صدیقی نے اپنے شباب کے شب و روز کا بڑا حصہ کلکتہ میں گزارا۔کلکتہ مغربی بنگال کا

گنجان آباد اور صنعتی شہر تھا۔ تقسیم ہند کے بعد جب یہ شہر ہندوستان کے حصے میں آیا۔ تو شاعرؔ صدیقی نے اپنے خاندان کے ہمراہ ہجرت کر کے مشرقی پاکستان کے شہر ڈھاکا میں مقیم ہوئے جہاں انہوں اپنی آدھی زندگی گزاری۔ سانحہ مشرقی پاکستان کے وقت ۱۹۷۳ء میں نیپال کے راستے سے ہجرت کر کے بے سروسامانی کی حالت میں پاکستان کے شہر کراچی پہنچے اور زندگی کا باقی حصہ یہاں پر گزار رہے ہیں۔ اب ان کی عمر ۹۰ برس کو پہنچ چکی ہے۔

تعلیم و تربیت

شاعرؔ صدیقی نے کلکتے کے ایک علمی و ادبی ماحول میں آنکھ کھولی تھی۔ جہاں سے اُن کی تعلیم و تربیت کا آغاز ہوا ہے لیکن اُن کی عملی زندگی کا آغاز ڈھاکا سے ہوا۔ انھوں نے زندگی کا زیادہ حصہ مشرقی پاکستان میں گزارا اور ساتھ اپنی تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ ابتدائی تعلیم انھوں نے مدرس عالیہ کے نام سے ایک سکول سے حاصل کی جہاں سے انہوں نے ۱۹۴۹ء میں میٹرک کا امتحان بھی پاس کیا ۱۹۵۰ء میں مشرقی پاکستان کے شہر ڈھاکا ہجرت کر کے چلے آئے۔ ڈھاکا میں قیام کے دوران سٹی کالج ڈھاکا سے انٹر کیا اور پھر قائداعظم کالج سے بی۔ اے کا امتحان پاس کیا ۱۹۶۳ء میں ایم اے (اُردو) ڈھاکا یونیورسٹی سے پرائیویٹ طور پر کر لیا اور پھر محکمہ جنگلات میں ملازمت اختیار کر لی۔ اس سلسلے میں شاعرؔ صدیقی یوں لکھتے ہیں:

> ''میٹرک کلکتہ یونیورسٹی سے ۱۹۴۹ء میں کیا اس وقت میٹرک کا امتحان یونیورسٹی کے تحت ہوتا تھا۔ باقی تعلیم سابق مشرقی پاکستان کے دارالحکومت ڈھاکا میں ہوئی'' (۸)

قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ شاعرؔ صدیقی خود کفالت تھے انھوں نے سخت مشقت کے دن گزارے ہیں۔ انھوں نے بے حد مصروفیت کے باجود اپنی تعلیم کا سلسلہ اور ادبی سرگرمیاں بھی جاری رکھیں اور اس کے ساتھ ساتھ وہ جز وقتی ملازمت بھی کرتے رہے۔ پروفیسر ہارون الرشید کچھ یوں لکھتے ہیں:

> ''سرکاری ملازمت، صحافت، ادبی سرگرمیاں، فلمی ذمہ داریاں سب ایک ساتھ چل رہی تھیں۔ انھیں مصروفیتوں کے درمیان انھوں نے

ڈھاکا یونیورسٹی سے انٹر، بی۔اے اور ایم۔اے (اُردو) کے امتحانات پاس کر لیے۔'' (۹)

پروفیسر ہارون الرشید مزید فرماتے ہیں:

''شاعرؔ صدیقی کی تعلیم و تربیت کلکتے کے علمی و ادبی ماحول میں ہوئی۔ انھوں نے علامہ رضا علی وحشت، حکیم ناطق لکھنوی، آرزو لکھنوی، حبیب النبی صولت، اکمل کلکتوی، آصف بنارسی، شاکر ؟ لکھنوی اور پروفیسر جمیل مظہری وغیرہ کی ادبی محفلوں کو دیکھا اور فطری رجحان کے تحت کم عمری میں خود بھی شعر کہنے لگے'' (۱۰)

شاعرؔ صدیقی کا علم و ادب سے بے حد شغف تھا وہ بے حد ذہین بھی تھے۔ جب اپنی نصابی سرگرمیوں سے فارغ ہوتے تو مدرسہ عالیہ کی لائبریری میں جا کر مختلف شعرا کے کلام کو پڑھتے تھے۔ مدرسہ عالیہ میں بیت بازی کے مقابلوں میں بھرپور حصہ لیتے تھے اور اپنی ذہانت، شوق اور محبت کے بنا پر ہمیشہ مقابلہ جیت جاتے تھے۔ بیت بازی کی جس ٹیم میں وہ شامل ہوتے تھے اُس ٹیم کی جیت یقینی ہوتی تھی۔

آغاز شاعری

انسان پر ماحول کے اثرات مرتب ہوتے ہیں جو کہ ایک فطری بات ہے۔ شاعرؔ صدیقی کا تعلق ایک ایسے ماحول سے رہا ہے جو شعر و ادب کا مرکز تھا۔ کلکتے کے علمی و ادبی ماحول نے اُن کے شعری ذوق کو اُبھارا۔ شاعرؔ صدیقی ایک کہنہ مشق شاعر ہے جن کا شعری سفر تقریباً ۷۵ برس پر پھیلا ہوا ہے۔ ویسے تو انہوں نے اپنی شاعری کا آغاز تقسیم ہند سے پہلے کیا تھا۔ لیکن باقاعدہ آغاز ۱۹۴۹ء میں ہوا تھا۔ وہ طبیعتاً بچپن ہی سے شاعری کی طرف مائل تھے۔ جب وہ مدرسہ عالیہ کے طالب العلم تھے۔ اس حوالے سے وہ کہتے ہیں:

''شاعری کے جراثیم میرے اندر غیر شعوری طور پرورش پا رہے تھے۔ میرے والد نہ شاعر تھے نہ موسیقار تھے مگر موسیقی سے بڑا شغف تھا وہ کلکتہ میں منعقد ہونے والے میوزک کنسرٹ میں باقاعدہ بحیثیت سامع شریک ہوتے تھے۔'' (۱۱)

مدرسہ عالیہ کلکتے کا ایک معروف علمی ادارہ ہے جہاں اکثر بیت بازی کے مقابلے منعقد ہوتے رہتے تھے۔جس کی وجہ سے طلبا میں شعری ذوق پروان چڑھتا تھا۔اسی ادارے کے طالب العلم ہونے کی وجہ سے شاعرؔ صدیقی میں بھی بیت بازی اور پھر شعر گوئی کا شغف پیدا ہوگیا اور یوں طبع زاد شاعری کی طرف مائل ہوگئے۔شاعرؔ صدیقی اس حوالے سے مزید کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

> ''بیت بازی سے شاعری کا شوق تو پروان چڑھ چکا تھا۔پھر میں ٹیویشن پڑھنے کے لیے جس استاد کے پاس جاتا تھا وہ کلکتہ کے مشہور شاعر کاملؔ کلکتوی تھے۔جب وہ کمرے نہ ہوتے تو میں ان کی بیاض اکثر پڑھتا تھا۔لہٰذا میرے دل میں بھی شعر کہنے کی تحریک پیدا ہوتی تھی مگر میں نے ابھی تک کوئی شعر نہیں کہا تھا،لیکن اساتذہ کے شعر پڑھنے کا سلیقہ مجھے خوب آتا تھا۔''(۱۲)

شاعرؔ صدیقی کی شعری صلاحیتوں کو پروان چڑھانے میں اُن کے دوستوں کا بھی بڑا حصہ ہے۔جن میں نمایاں نام مطیع الرحمان کا ہے جو شاعرؔ صدیقی کے لڑکپن کے قریبی دوست تھے۔جنہوں نے شاعرؔ کی ابتدائی شاعری کی ہمیشہ پذیرائی کی ہے۔اور اس کی ہمت افزائی کی وجہ سے شاعرؔ صدیقی میں شعر کہنے کا جذبہ پروان چڑھتا رہا۔

اس شعری سفر میں جن حضرات نے شاعرؔ صدیقی کے شعری ذوق کو نکھارنے میں اہم کردار ادا کیا ان میں عقیل الرحمٰن خان بھی ہیں جو شاعرؔ صدیقی کے چچازاد بھائی ہیں۔جنہوں نے اُن کی شاعری کے ہر موڑ پر پذیرائی کی تھی۔اس کے علاوہ شاعر صدیقی کا بڑا بھائی جس کا نام عبدالستار خان ہے جو خود بھی شاعر تھے۔انہوں نے بھی شاعر کے کلام کی پذیرائی کی ہے۔جس کے بنا پر شاعرؔ صدیقی کے شعری ذوق کو جلا ملتی گئی اور آگے بڑھتے رہے۔شاعرؔ صدیقی کہتے ہیں:

> ''میرے شعری ذوق کو سنوارنے اور نکھارنے کے لیے میرے تایازاد بھائی عقیل الرحمان خان کا بڑا ہاتھ ہے جو مجھے لڑکپن میں اپنے پاس پاکستان میں بلا کر اپنے ساتھ رکھا۔اور شعری ذوق کی ہمیشہ پذیرائی

کی۔اس سلسلے میں میرے اپنے بڑے بھائی عبدالستار خان جو راشد الناصری کے نام سے شاعری کرتے تھے اُنہوں نے بھی میرے شعری ذوق کی پذیرائی کی اور جب سابق مشرقی پاکستان میں اُردو بولنے والوں کے خلاف قتل عام شروع ہوااور گھر بار لٹا تو اُنہوں نے اپنے پاس میرے کلام کا ذخیرہ جو سنبھال کر رکھا ہوا تھا مجھے مغربی پاکستان آنے کے وقت دیا۔اس طرح میرے کلام کا ایک حصہ تباہ ہونے سے بچ گیا۔''(۱۳)

اس ضمن شاعرؔ صدیقی بے حد خوش قسمت تھے کہ ایک تو انہیں ایسا ماحول میسر آیا جو شروع سے علم وادب کا مرکز رہا تھا۔دوسری اہم بات یہ ہے کہ اُن کے دوست واحباب اور عزیز واقارب ہمیشہ اُن کی حوصلہ افزائی کرتے رہے۔

شاعرؔ صدیقی نے جب شعر کہنا شروع کیا تو اس وقت کلکتے میں کامؔل کلکتوی، وحشتؔ علی رضاؔ، آزادؔ لکھنوی، حکیم نانق لکھنوی، شاکرؔ لکھنوی اور پروفیسر جمیل مظہر جیسے بڑے بڑے شعرا موجود تھے۔اس وقت کلکتے میں آل انڈیا ریڈیو کے مشاعرے منعقد ہوتے تھے۔جس میں برصغیر کے بڑے بڑے شعرا ساحرؔ لدھیانوی، حفیظؔ جالندھری، مجروح سلطان پوری، کیفی اعظمی اور سردار جعفری جیسے معروف ومقبول شعرا شرکت کرتے تھے۔اس ماحول کی وجہ سے اُن میں شاعری کا ایک فطری رجحان بڑھتا گیا اور وہ طبع زاد شعر گوئی کی طرف مائل ہوگئے۔

میٹرک سے فارغ ہونے کے بعد اُنہوں نے اپنی شاعری کا باقاعدہ آغاز کر دیا۔۱۹۴۹ء میں اُنہوں نے شاکرؔ کلکتوی کے گھر منعقد ہونے والے ایک مشاعرے میں اپنی پہلی غزل سنائی۔جس پر محفل میں ہر جانب سے واہ واہ کی آوازیں گونجنے لگیں۔اُس وقت شاعرؔ صدیقی کی عمر ۱۶ سال تھی۔یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان کے تقسیم ہونے کا سلسلہ جاری تھا اور ملک میں ہر طرف ہندو مسلم فسادات عروج پر تھے۔

شاعرؔ صدیقی نے جب شاعری شروع کی تو اس وقت کلکتے کے ادبی ماحول میں دو طرز فکر کے شعرا موجود تھے ایک طرف ترقی پسند ادب کا چرچا تھا اور دوسری جانب روایتی اور کلاسیکل ادب کے

پیرو رکار بھی بہت تھے۔شاعرؔ صدیقی ترقی پسند تحریک سے متاثر تھے جن کے نقوش اُن کے کلام میں جا بجا نظر آتے ہیں۔

آغاز ملازمت

شاعرؔ صدیقی نے بہت مشکل زندگی گزاری ہے تلاش معاش کے مسئلے نے انہیں عمر بھر جکڑ لیا تھا۔میٹرک پاس کرنے کے بعد شاعرؔ صدیقی ملازمت کی تلاش میں تھے۔اس جستجو میں انہوں نے کمرشل کالج کلکتہ میں شارٹ ہینڈ اور ٹائپنگ سیکھنے کے لیے داخلہ لیا یہ کورس جب ایک سال میں مکمل ہوا تو وہ ملازمت کی غرض سے ڈھاکا آئے اور ایک ماہ بعد انہیں بورڈ آف ریوینیو کے ذیلی ادارے میں (اپلی کیشن کمیونٹی) میں بحیثیت سٹینوگرافر نوکری مل گئی۔تعلیم و تربیت کے بعد شاعرؔ صدیقی نے عملی زندگی کا آغاز سرکاری ملازمت سے کیا اس کے بعد تعلیم کو جاری رکھتے ہوئے انہوں نے ڈھاکہ یونیورسٹی سے ایم اے کی ڈگری حاصل کی اور ایگریکلچر ڈولپمنٹ کارپوریشن (ADC) سے وابستہ ہوگئے اور اسی طرح ملازمت میں آگے بڑھتے گئے ۱۹۶۴ء میں شاعرؔ صدیقی جز وقتی طور پر جگن ناتھ کالج ڈھاکا میں پبلک سروس کمیشن کے ذریعے بحیثیت اُردو لیکچرر تعینات ہوئے۔اس عہدے پر اُنہوں نے بہت قلیل عرصہ گزارا۔کیوں کہ وہ اس میں خوش نہ تھے جس پر انہوں نے گیت اور فلمی دنیا کو ترجیح دی اور درس و تدریس کو ہمیشہ کے لیے خیر آباد کہہ دیا۔سقوط ڈھاکا کے بعد وہ پاکستان چلے آئے اور اُنہیں ایک بار پھر ملازمت کا مسئلہ درپیش آیا۔جس کی وجہ سے اُن کا دل لکھنے سے کافی عرصہ اُچاٹ ہوگیا تھا۔لیکن جب کراچی میں انھیں ۱۹۷۲ء میں واپڈا کے ایک پروجیکٹ میں ملازمت مل گئی تو اُنھوں نے اپنی ادبی سرگرمیاں از سرنو شروع کی۔اور مشق سخن کو جاری رکھا۔واپڈا میں ملازمت ملنے کی وجہ سے اُن کی معاشی مسئلہ حل ہوگیا۔شاعرؔ صدیقی اس ملازمت سے ۱۹۹۳ء میں سبکدوش ہوگئے۔لیکن اپنی محنت اور مشقت کا سفر جاری رکھتے ہوئے پرائیویٹ نوکریاں بھی کرتے رہے۔شاعرؔ صدیقی کا کہنا ہے:

''میں نے ۱۹۹۳ء میں سرکاری ملازمت سے ریٹائرمنٹ کے بعد PharmaceuticalManufacturesPakistan Assocation(P.P.M میں بہ حیثیت اسسٹنٹ سیکریٹری جوائن

کرلیا بعد میں پھر میں سیکرٹری جنرل کے عہدے تک پہنچا اور ۲۰۰۹ء
میں یہاں سے بھی ریٹائرڈ ہوگیا۔'' (۱۴)

شاعرؔ صدیقی زندگی میں تن آسانی کے قائل نہیں تھے۔ وہ محنت اور جہد مسلسل پر یقین رکھتے تھے۔ جب تک اُن کی صحت نے اُن کا ساتھ دیا اُس وقت تک وہ ملازمت کرتے رہے۔

ازدواجی زندگی

شاعرؔ صدیقی کی شادی ۱۹۶۹ء کو ڈھاکا میں ہوئی جہاں سے اُن کی ایک کامیاب ازدواجی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ اُن کی بیوں کا نام ذکیہ سلطانہ ہے جو ڈھاکا کی رہائشی تھیں۔ ایسا لگتا ہے کہ ماں کی وفات کے بعد شاعرؔ صدیقی کی زندگی میں اہمیت کی حامل شخصیت اُن کی شریک حیات ہیں۔ شاعرؔ صدیقی نے اپنی ساری زندگی اُن کے نام کردی ہے۔ وہ اُن سے بے انتہا محبت کرتے ہیں۔ اس کا اندازہ کچھ یوں لگایا جاسکتا ہے کہ شاعرؔ صدیقی نے اپنے پہلے شعری مجموعے ''آنکھوں میں سمندر'' کا انتساب اپنی شریک حیات ذکیہ سلطانہ کے نام کرتے ہوئے لکھا ہے:

کتاب زیست کا میں انتساب لکھتا ہوں
تمہارے نام یہ اپنی کتاب لکھتا ہوں
(۱۵)

شاعرؔ صدیقی کی شریک حیات ذکیہ سلطانہ کی وفات حال ہی فروری ۲۰۲۱ء بمقام کراچی گلستان جوہر میں ہوئی۔ جو اُن کے لیے ضعیف العمری میں کسی بڑے سانحے سے کم نہ تھی۔ کیوں کہ اُن کے ساتھ شاعرؔ صدیقی نے اپنی زندگی کے تقریباً ۲۵ سال گزارے تھے۔

اولاد

شاعرؔ صدیقی کی تین اولاد ہے جس میں ایک بیٹا ہے جس کا نام جاوید فردوس خان ہے جو سعودی عرب میں ملازمت کرتا ہے اور شاعرؔ صدیقی کے بڑھاپے کا سہارا ہے۔ دو بیٹیاں ''کنول'' اور ''رباعی'' ہیں سب کی شادیاں ہوچکی ہیں اور سکون کی زندگی بسر کررہی ہیں۔ وہ بیان کرتے ہیں:

''میری تین اولاد ہے۔ایک بیٹا جس کا نام جاوید فردوس خان ہے جو آجکل سعودی عرب میں ایک فرم کے اعلیٰ عہدے پر فائز ہے اور انجینئر ہے۔ایک بیٹی جس کا نام ''کنول'' ہے اسکی شادی ایک وکیل کے ساتھ ہوئی ہے جو WELLCOMEGLAXO میں RIGHTCOPY ADVISER ہے۔جبکہ دوسری بیٹی کا نام رباعی ہے۔جس کی شادی محمد مبین خان سے ہوئی ہے۔اور وہ ACCOUNTANT CHARTER ہے اور دبئی میں ملازم ہے۔''(۱۶)

شاعرؔ صدیقی نے اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔اُن کے سارے بچے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔شاعرؔ صدیقی اب نانا اور دادا بھی بن چکے ہیں۔جن کو وہ اپنا سرمایہ حیات سمجھتے ہیں۔وہ بچوں سے بے حد محبت رکھتے ہیں۔جس کا اندازہ اس لگایا سکتا ہے کہ انہوں اپنے کلیات کا انتساب اپنے بچوں کے نام کر دیا ہے۔جس میں جاوید فردوس خان، کنول اور رباعی کے علاوہ انہوں اپنے نواسوں اور پوتوں کے نام شامل کیے ہیں۔

سیرت اور شخصیت

شاعری اور شخصیت کا آپس میں بہت گہرا رشتہ ہوتا ہے۔شاعرؔ صدیقی ایک بڑے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھے انسان بھی ہیں۔اُن کی شخصیت اُن کی شاعری میں نکھری ہوئی دکھائی دے رہی ہے۔وہ ایک باوقار شخصیت ہیں۔سیرت و کردار کے حوالے سے شاعرؔ صدیقی ایک ہمدرد اور انسان سے محبت کرنے والے ہیں۔وہ ہمیشہ دوسروں کی فلاح کے لیے سوچتے ہیں جس میں کبھی اُنہوں نے دوست اور دشمن کا امتیاز روا نہیں رکھا ہے۔جس کا پتہ اُن کے کلام کے مختلف گوشوں سے چلتا ہے۔وہ شرافت، عاجزی وانکساری، خوش مزاجی، حق گوئی اور بردباری جیسے اعلیٰ اوصاف کے مالک ہیں۔اس ضمن میں پروفیسر ہارون الرشید یوں تحریر کرتے ہیں:

''شاعرؔ صدیقی ایک شریف، خداترس، ملنسار، ہمدرد، خوش مزاج اور حق گو انسان ہیں۔ان میں انکساری بہت زیادہ ہے۔غرور تکبر نام

کونہیں۔دکھ درد صبر وتحمل سے برداشت کرنے کی صلاحیت بھی ہے۔ان
کی شخصیت کی یہ خوبیاں ان کی شاعری میں جلوہ گر ہیں'' (۱۷)

شاعرؔ صدیقی نے زندگی کی مصروفیات کے باوجود بھی اپنی انکساری،خوش اخلاقی،خوش مزاجی برقرار رکھی ہے۔دوسروں کے کام آنا اور مدد کرنا ایک اہم مشغلہ ہے۔امیر حسین چمنؔ اُن کی شخصیت کے حوالے سے اظہار خیال کرتے ہیں:

''بحیثیت انسان شاعرؔ صدیقی ایک مخلص دردمند،خوددار اور شریف النفس
انسان ہیں۔دوست تو دوست دشمن کی بہتری اور فلاح کے لیے بھی اگر
کچھ کر سکتے ہو تو پیچھے نہیں رہتے'' (۱۸)

شاعرؔ صدیقی نے ہمیشہ محنت اور مشقت پر یقین رکھا ہے۔سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد بھی اُنہوں نے اپنی بسر اوقات کے لیے جدوجہد جاری رکھی۔وہ اپنی گرتی ہوئی صحت کے باوجود بھی ذمہ داری سے پیچھا چڑانے کے قائل نہیں تھے۔اور بہت رسیدہ عمر میں جب صحت نے بالکل ساتھ نہ دیا تو اُنہوں نے پرائیویٹ ملازمت سے ۲۰۰۹ء میں ریٹائرمنٹ لے لی۔

شاعرؔ صدیقی ایک غیر متعصب انسان ہیں وہ کبھی بھی کسی کا بُرا نہیں چاہتے ہیں۔وہ پوری انسانیت کے لیے دل میں ایک گہرا درد اور احساس رکھتا ہے۔اُن کی شاعری میں انسان دوستی کا برملا اظہار ملتا ہے۔اپنے شعور وآگہی کے بنا پر انہوں نے بہت ہی کم عمری شاعری شروع کی تھی۔اُن کی شاعری اس وقت کے معاشرے کے افراد پر گزرے ہوئے دل سوز واقعات اور حادثات کا آئینہ ہے۔اُن کے فکر وتخیل پر ہمیشہ کے لیے ایثار کا جذبہ غالب رہا ہے۔زندہ دلی اُن کی شخصیت کی بہترین خوبی ہے۔وہ جب بھی کسی سے ملتے ہیں تو ہنسی ہمیشہ اُن کی لبوں پر ہوتی ہے۔لیکن اس میں سنجیدگی برقرار رہتی ہے۔اپنی شاعری کے وساطت سے انہوں نے ہمیشہ معاشرے کی اصلاح چاہی ہے۔وہ اپنی شاعری کے ذریعے حالات کی کروٹ سے اپنے قاری کو آگاہ کرتے ہیں۔انہوں نے ہمیشہ علم کی روشنی پھیلانے کی پرچار کی ہے اور علم وہنر کی دولت بانٹی ہے۔وہ علم وہنر کا پیکر ہیں۔اُن کا ہر کام علم وادب سے وابستہ ہے۔

علاوہ ازایں شاعرؔ صدیقی کی وابستگی دین اور مذہب سے بھی بہت مضبوط ہیں۔وہ ایک راسخ

عقیدے کے مالک ہیں۔ وہ ایک سچے عاشق رسول ﷺ بھی ہیں جس کا اندازہ اُن کے تقریباً تمام شعری اصناف سے لگایا جاسکتا ہے۔

شاعرؔ صدیقی نہ صرف ایک بڑے شاعر ہیں بلکہ ایک عمدہ نثر نگار بھی ہیں۔ ادب کے دنیا میں اوہ اپنی غزل گوئی کی وجہ سے شہرت اور مقبولیت رکھتے ہیں جبکہ فلمی دنیا میں وہ ایک کامیاب گیت نگار تسلیم کیے جاتے ہیں۔ اپنے اس شعری ذوق کی بنا پر اُن کا نام مشرقی پاکستان میں بھی عزت اور احترام سے لیا جاتا ہے۔ شاعرؔ صدیقی کو اللہ تعالیٰ نے بے پناہ شہرت دی ہے لیکن اُس کی شخصیت کا ایک اور مثبت پہلو یہ بھی ہے کہ اُنھوں نے کبھی بھی اپنی شہرت کے لیے کسی بھی لالچ اور خودغرضی کا مظاہرہ نہیں کیا ہے۔ وہ دنیاوی شہرت کے پیچھے بھاگنے والوں میں سے نہیں ہے۔ حق گوئی اور بے باکی اُن کا وطیرہ ہے۔ سچ کہنا اور سچ لکھنا اُن کی فطرت ہے۔

دوست واحباب

شاعرؔ صدیقی اپنی زندگی میں دوستی اور دوستوں سے محبت کا ایک الگ باب رکھتے ہیں۔ وطن چھوڑنے کی احساس محرومی نے دوستوں کے ساتھ اُن کی محبت اور عقیدت میں بے پناہ اضافہ کیا ہے۔ اور اسی محبت نے ''میرے ہمدم میرے دوست'' کے عنوان سے ایک کتابی شکل اختیار کر لی ہے۔ جس میں شاعرؔ صدیقی نے تقریباً تمام قریبی دوستوں پر صراحت کے ساتھ مضامین لکھے ہیں۔ شاعرؔ صدیقی کے دوست تو بہت زیادہ ہیں لیکن اُن کے لڑکپن کے دوستوں میں سب سے عزیز دوست مطیع الرحمان تھے۔ مطع الرحمان کا تعلق کلکتہ سے ہے۔ شاعرؔ صدیقی ان کے حوالے سے یوں لکھتے ہیں:

> ''مطیع الرحمان (جو اب کلکتہ بھارت میں ہیں) میرے سب سے عزیز دوست ہیں جسے عرف عام میں جگری دوست کہتے ہیں۔ لڑکپن اور جوانی کی بہت ساری یادیں اس سے وابستہ ہیں'' (۱۹)

شاعری کے سفر میں مطیع الرحمان نے شاعرؔ صدیقی کے شعری ذوق بڑھانے اور ہمت افزائی میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس زمانے کے اہم ساتھیوں میں حامد اور ظفرؔ صدیقی بھی شامل ہیں، جو شاعرؔ صدیقی کے شعری سفر میں معاون ثابت ہوئے۔ شاعرؔ صدیقی کے دوستوں میں اکثریت شعرا اور

ادیبوں کی ہے۔ جو علم وادب سے وابستہ ہیں۔ مشرقی پاکستان میں قیام کے وقت اُن کے قریبی دوستوں میں اخترؔ لکھنوی، حبیب حسن، خواجہ ریاض الدین عطشؔ، واحد نظامی شامل ہیں۔ ڈھاکا میں شاعرؔ صدیقی کے پہلے دوست اخترؔ لکھنوی تھے، جو خود بھی ایک ممتاز شاعر تھے۔ شاعرؔ صدیقی اُن سے بہت عقیدت رکھتے تھے۔ شاعرؔ صدیقی، اخترؔ کے حوالے سے رقمطراز ہیں:

> ''مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب ۵۲۔۱۹۵۱ء میں کلکتہ سے ڈھاکا ہجرت کر کے گیا تو ڈھاکا میں وہ میرا پہلا دوست بنا۔ یوں تو اخترؔ مجھ سے عمر میں تین چار سال بڑا تھا مگر اس نے کبھی بھی اپنے بڑے ہونے کا رعب ڈالنے کی کوشش نہیں کی'' (۲۰)

حال میں شاعرؔ صدیقی کے دوستوں میں نمایاں نام امیر حسین چمنؔ کا ہے جو ایک افسانہ نویس ہیں۔ امیر حسین چمنؔ کے ساتھ شاعرؔ صدیقی کی دوستی کا دورانیہ تقریباً ۳۳ برس پر محیط ہے جو پاکستان میں اُن کا سب سے عزیز دوست ہے۔ امیر حسین چمن کا نام اس حوالے سے بھی اہم ہے کہ اُنہوں شاعرؔ صدیقی کا پہلا مجموعہ کلام ''آنکھوں میں سمندر'' ۲۰۰۴ء میں اسلام آباد پرنٹ میڈیا سے شائع کروایا تھا۔ جس کی وجہ سے شاعرؔ صدیقی کا کلام ضائع ہونے سے بچ گیا۔ امیر حسین چمن کے اس احسان و کارنامے کو شاعرؔ صدیقی نے ہمیشہ سراہا ہے۔

ان کے علاوہ عصر حاضر میں شاعرؔ صدیقی کے قریبی دوستوں میں ڈاکٹر زاہد حسین، سہیل غازی پوری، شاداب صدیقی، شاعر علی شاعرؔ، ڈاکٹر محمد ظفر خان ظفرؔ اور نور جاوید شامل ہیں۔ جن کے خاکے شاعرؔ صدیقی نے اپنی کتاب ''میرے ہمدم میرے دوست'' میں تحریر کیے ہیں جو اس بات کا ثبوت ہے کہ شاعرؔ صدیقی اپنے دوستوں سے بے لوث محبت وعقیدت رکھتے ہیں۔

دوست انسان کی زندگی کا اہم حصہ ہوتا ہے۔ زندگی میں دوستوں کے سہارے کی ضرورت ہر موڑ پر ضرور محسوس کی جاتی ہے۔ دوستوں کے بنا زندگی ادھوری اور بے معنی سمجھی جاتی ہے۔ اچھے دوست انسان کی کامیابی و کامرانی میں مددگار و معاون ثابت ہوتے ہیں۔

شاعرؔ صدیقی کو گم نامی کے گوشوں سے نکالنے میں اُن کے مخلص دوستوں کا ہاتھ ہے، جنہوں نے

اُن کی ہمت افزائی کے ساتھ ساتھ وقتاً فوقتاً اُن کا کلام بھی شائع کیا ہے، جس کی وجہ سے ہر خاص و عام اُن کے فکر وفن کے جوہر سے آشنا ہو گیا ہے اور اُنہیں شہرت کے ساتھ بے پناہ مقبولیت سے بھی ہم کنار کیا۔

تصانیف کا تعارف

ایک ممتاز شاعر ہونے کے ساتھ شاعرؔ صدیقی ایک بلند پایہ نثر نگار اور صحافی بھی ہیں۔ اُنہوں نے بہت سے افسانے بھی لکھے ہیں اور صحافت کے میدان میں آنے کے بعد مضامین، فیچر، کالم اور اداریے بھی لکھ چکے ہیں۔ اُن کی تحریریں اُسلوب کے معیار کے لحاظ کافی اہمیت کی حامل ہیں۔ لیکن جس چیز نے شاعرؔ صدیقی کو گوشہ گم نامی سے نکالا وہ اُن کی شاعری ہے۔ شاعرؔ صدیقی کے شعری اور نثری سرمائے کا بڑا حصہ مسودوں کی شکل میں سقوط ڈھاکا کے وقت ضائع ہو چکا ہے جن میں ''شیشہ وسنگ''، ''پانی کا ملک''، ''پتھر کے لوگ'' کے علاوہ نثری سرمایہ بھی شامل تھا۔ تاہم پاکستان آنے کے بعد اُن کے پاس جو کچھ بچا تھا ان کو اپنے پہلے مجموعہ کلام بعنوان ''آنکھوں میں سمندر'' ۲۰۰۴ء میں شائع کروایا۔ شاعرؔ صدیقی لکھتے ہیں:

> ''یوں تو میرا پہلا مجموعہ کلام ''شیشہ وسنگ'' تھا جو قاری تک پہنچنے سے پہلے ہی ۱۹۷۱ء میں المیہ یا سانحہ مشرقی پاکستان کا نذر ہو گیا، دوسرا مختصر سا مجموعہ کلام ''پانی کا ملک پتھر کے لوگ'' جو مشرقی پاکستان کے سانحہ کے پس منظر میں تھا اور ۱۹۷۱ء کے آرمی ایکشن سے ۱۹۷۳ء میں کراچی پہنچنے تک کے کلام پر مبنی تھا کسی پبلشر کی عدم دستیابی اور سرمایہ کی کمی کے باعث شائع نہ ہو سکا۔ اسی طرح پہلی بار شائع ہونے والے میرے اس مجموعہ کلام ''آنکھوں میں سمندر'' کو آپ میرا تیسرا مجموعہ کلام بھی کہہ سکتے ہیں۔''(۲۱)

بہر حال شاعرؔ صدیقی کا زیور طباعت سے آراستہ ہونے والا پہلا مجموعہ ''آنکھوں میں سمندر'' ہے۔ جو پرنٹ میڈیا پبلی کیشنز اسلام آباد سے ۲۰۰۴ء میں شائع ہو چکا ہے۔ اس مجموعے کے مرتب شاعرؔ صدیقی کے ایک مخلص دوست امیر حسین چمن ہیں۔ جنہوں نے اس پہلے مجموعہ کو شائع کرنے میں شاعرؔ کیساتھ اپنی دوستی کا پورا پورا حق ادا کیا ہے۔ اس مجموعے میں تقریباً ۶۰ غزلیں اور ۱۴ نظموں کے علاوہ

گیت، دوہے، قطعات، اور رباعیات بھی شامل ہیں۔اس کے علاوہ اس مجموعے میں شاعرؔ صدیقی کے فن اور شخصیت کے حوالے مختلف مشاہر فن کے مضامین بھی شامل ہیں۔ یہ مجموعہ ۲۱۶ صفحات پر مشتمل ہے۔

بجھتے سورج نے کہا

شاعرؔ صدیقی کا دوسرا مجموعہ کلام ''بجھتے سورج نے کہا'' ہے۔ یہ مجموعہ ستمبر ۲۰۰۹ء میں رنگ ادب پبلی کیشنز کراچی سے شائع ہوا تھا۔ یہ مجموعہ ۱۶۰ صفحات پر مشتمل ہے۔اس میں تقریباً ۷۵ غزلیں اور ۱۴ نظموں کے علاوہ حمدیہ اور نعتیہ قطعات بھی شامل ہیں۔

جگرِ لخت لخت

شاعرؔ صدیقی کا تیسرا مجموعہ کلام ''جگرِ لخت لخت'' جو محض رباعیات اور قطعات پر مشتمل ہے۔ اس مجموعے کا سن اشاعت ستمبر ۲۰۱۲ء ہے جو رنگ ادب پبلی کیشنز کراچی سے شاعر علی شاعرؔ کی نگرانی میں شائع ہوا تھا۔اس مجموعے کا انتساب شاعرؔ صدیقی نے اپنے لڑکپن کے ایک عزیز دوست مطیع الرحمان کے نام کیا ہے۔کتاب کا آغاز حمدیہ اور نعتیہ قطعات سے ہوا ہے۔اس کے علاوہ اس میں ۱۳۲ قطعات عام موضوعات پر اور ۱۵ اشخصی قطعات کے علاوہ ۲۰ رباعیات بھی شامل ہیں۔شاعرؔ صدیقی رقمطراز ہیں:

> ''اس مجموعے میں شامل پچھتر فی صد قطعات ایک خاص دور کی پیداوار ہیں۔جیسے میں ''دور جنوں'' سے تعبیر کرتا ہوں۔باقی پچیس فی صد مختلف اوقات میں حالات ومشاہدات کے پیش نظر وجود میں آئے ہیں'' (۲۲)

پانی کا ملک پتھر کے لوگ

''پانی کا ملک پتھر کے لوگ'' شاعرؔ صدیقی کا چوتھا اور مختصر مجموعہ کلام ہے جو بہت تاخیر کے ساتھ مئی ۲۰۱۵ء میں شائع ہو چکا ہے۔ یہ دراصل سانحہ مشرقی پاکستان کے پس منظر میں ایک طویل نظم ہے جو سانحہ مشرقی پاکستان کے بعد لکھی گئی ہے۔اس کتاب کی شاعری مشرقی پاکستان میں آرمی ایکشن کے بعد ۱۹۷۱ء تا ۱۹۷۳ء کے دورانیہ پر مشتمل ہے۔

سندر بن میں آگ

''سندر بن میں آگ'' شاعرؔ صدیقی کا پانچواں شعری مجموعہ ہے۔اس میں گیت،نغمات اور دوہے شامل ہیں۔علاوہ ازیں شاعرؔ صدیقی کی حیات وجہات کے ضمن میں معروف شاعروں اور ادیبوں کے چند مضامین بھی شامل کیے گئے ہیں۔کتاب میں گیتوں کی تعداد دیگر اصناف کے مقابلے میں زیادہ ہے۔اس میں شاعرؔ صدیقی کے فلم ، ٹیلی ویژن ، ریڈیو، کیسٹ اور ادبی رسائل وجرائد میں شائع ہونے والے مقبول گیتوں کو یکجا کر کے شامل کیا گیا ہیں۔کتاب کے آخر میں شاعر کا مختصر تعارفی مضمون بھی ہے۔

شاعرؔ صدیقی کا یہ مجموعہ ''سندر بن میں آگ'' مارچ ۲۰۱۶ء میں رنگ ادب پبلی کیشنز کراچی سے زیور طباعت سے آراستہ ہوا۔جو تقریباً ۲۵۶ صفحات پر مشتمل ہے۔

شام کا سورج (کلیات شاعرؔ صدیقی)

''شام کا سورج'' شاعرؔ صدیقی کا آخری اور چھٹا مجموعہ کلام ہے۔جو غیر مطبوعہ ہے اور پہلی دفعہ کلیات شاعرؔ صدیقی میں دیگر مجموعہ ہائے کلام کے ساتھ یکجا ہو کر شائع ہوا۔کلیات شاعرؔ صدیقی میں شاعر کے مذکورہ بالا مجموعے اگست ۲۰۱۹ء میں ایک ساتھ رنگ ادب پبلی کیشنز کراچی سے شائع ہوئے ہیں۔کلیات کی ترتیب محمود اختر خان نے کی ہے اور کتاب کا مقدمہ اکرم کنجاہی نے لکھا ہے جو عصر حاضر ایک معروف شاعر اور نقاد ہے۔یہ کلیات ۸۰۰ صفحات پر مشمل ہے۔

میرے ہمدم میرے دوست

''میرے ہمدم میرے دوست'' شاعرؔ صدیقی کی نثری تصنیف ہے۔جو مارچ ۲۰۱۸ء میں منظر عام پر آئی ہے۔اس کتاب میں شاعر نے اپنے ہم عصر دوست واحباب کے حوالے مضامین اور کچھ خاکے تحریر کیے ہیں۔اس کتاب میں شامل مضامین کے حوالے سے شاعرؔ صدیقی یوں لکھتے ہیں:

> ''یہ مضامین وقتاً فوقتاً لکھے گئے یا لکھوائے گئے رسالوں اور کتابوں میں شائع بھی ہوئے۔چند احباب کا مشورہ یا اصرار بھی تھا کہ ان مضامین کو محفوظ کرنے کے لیے کتابی شکل میں آنا ضروری ہے۔لہٰذا جو مضامین

دستیاب ہوئے وہ اس کتاب میں شامل ہیں‘‘(۳۲)

کتاب میں جن شاعروں اور ادیبوں کے حوالے سے مضامین شامل ہیں ان میں اختر لکھنوی، اخی بیگ، رشید الزمان خلشؔ، زخمی کانپوری، سہیل غازی پوری، شاداب صدیقی، واحد نظامی، عارف ہوشیار پوری، ظفر محمد خان ظفرؔ، امیر حسین چمن اور شاعر علی شاعرؔ وغیرہ شامل ہیں۔

شاعرؔ صدیقی کی زندگی غم اور مسرت کے ساتھ ساتھ بہتا ہوا ایک ایسا دریا ہے جس میں خوشی اور شادمانی کی ہر لہر کو وقت کی آندھی نے ہمیشہ غارت کر دیا ہے۔ اُن کے خاندانی پس منظر پر اگر نظر دوڑائی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ محض شاعرؔ صدیقی نے ہجرت کے دکھ نہیں سہے بلکہ اُن کا پورا خاندان اس کرب سے گزرا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ جنہوں نے ایک شہر سے دوسرے شہر اور پھر اس طرح مستقل طور پر کلکتہ شہر میں مقیم ہو گئے۔ جو شاعرؔ کا پیدائشی وطن بھی اور یہاں شاعر؟ صدیقی کی شعری سفر کا آغاز بھی ہوتا ہے۔ یہاں پر اُن کو ایسا ماحول میسر آیا جس نے اُن کی شعری ذوق اور پوشیدہ صلاحیتوں کو اُبھارا۔ یہ ایک ادبی ماحول تھا جس میں اُس وقت جید شعرا موجود تھے جن کے چرچے محض اس خطے تک محدود نہ تھے بلکہ سارے ملک میں بھی اُن کا نام عزت اور وقار کے ساتھ لیا جاتا تھا۔

کلکتہ سے ڈھاکا شہر ہجرت کے بعد شاعرؔ نے بڑی مشقت کی زندگی بسر کی ہے۔ ملازمت کے ساتھ ساتھ اُنہوں نے مزید تعلیم بھی جاری رکھی اور مشق سخن بھی جاری رکھی۔ دوسری ہجرت اُن کے لیے کرب ناک سانحہ تھا جس میں اُنہوں نے اپنے، دوست واحباب کے ساتھ اپنا ادبی سرمایا بھی کھو دیا۔ جس کا رنج اُنہیں ساری زندگی رہا۔ شاعرؔ صدیقی کی شخصیت کے پوشیدہ گوشے اُن کی شاعری کے جھروکوں میں عیاں ہیں۔ اُن کی داخلی کیفیات کا اندازہ اُن کے کلام سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

حوالہ جات

۱۔شاعر صدیقی، انٹرویو، کراچی، ۵فروری ۲۰۱۲ء

۲۔شاعرؔ صدیقی، انٹرویو، ایضاً ۳۔شاعرؔ صدیقی، انٹرویو، ایضاً

۴۔شاعرؔ صدیقی، انٹرویو، ایضاً

۵۔شاعرؔ صدیقی، مشمولہ، حالات، زندگی، رنگ ادب شاعرؔ صدیقی نمبر جولائی تا ستمبر ۲۰۰۶ء ص ۵۱

۶۔شاعر صدیقی، انٹرویو، کراچی، ۱۷ اگست ۲۰۲۰ء

۷۔ہارون الرشید، پروفیسر، چند معاصر، گرافکس میڈیا، پبلی کیشنز کراچی، ۲۰۱۱ء ص ۴۶

۸۔شاعرؔ صدیقی، مشمولہ، حالات، زندگی، رنگ ادب شاعرؔ صدیقی نمبر جولائی تا ستمبر ۲۰۰۶ء ص ۵۱

۹۔ہارون الرشید، پروفیسر، چند معاصر، گرافکس میڈیا، پبلی کیشنز کراچی، ۲۰۱۱ء ص ۲۷

۱۰۔ایضاً

۱۱۔شاعرؔ صدیقی، مشمولہ، حالات، زندگی، رنگ ادب شاعرؔ صدیقی نمبر جولائی تا ستمبر ۲۰۰۶ء ص ۱۵

۱۲۔شاعرؔ صدیقی، سندر بن میں آگ، رنگ ادب پبلی کیشنز، کراچی، ۲۰۱۶ء، ص ۳۲

۱۳۔شاعر صدیقی، انٹرویو، کراچی، ۱۷ اگست ۲۰۲۰ء

۱۴۔شاعرؔ صدیقی، سندر بن میں آگ، رنگ ادب پبلی کیشنز، کراچی، ۲۰۱۶ء، ص ۴۴

۱۵۔شاعرؔ صدیقی، آنکھوں میں سمندر، پرنٹ میڈیا پبلی کیشنز، اسلام آباد ۲۰۰۴ء، ص ۵

۱۶۔شاعر صدیقی، انٹرویو، کراچی، ۱۷ اگست ۲۰۲۰

۱۷۔ہارون الرشید، پروفیسر، رنگ ادب شاعرؔ صدیقی نمبر جولائی تا ستمبر ۲۰۰۶ء ص ۶۵

۱۸۔امیر حسین چمن، رنگ ادب شاعر؟ صدیقی نمبر جولائی تا ستمبر ۲۰۰۶ء ص ۳۵

۱۹۔شاعرؔ صدیقی، انٹرویو، ۲۹ جولائی ۲۰۲۰ء

۲۰۔شاعرؔ صدیقی، میرے دوست ہمدم میر دوست، رنگ ادب پبلی کیشنز، کراچی، ۲۰۱۸ء ص ۱۱

۲۱۔شاعرؔ صدیقی، آنکھوں میں سمندر، پرنٹ میڈیا پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۲۰۰۴ء ص ۳۶

۲۲۔شاعرؔ صدیقی، جگر لخت لخت، رنگ ادب پبلی کیشنز، کراچی، ۲۰۱۲ء ص ۸

۲۳۔شاعرؔ صدیقی، میرے ہمدم میرے دوست، رنگ ادب پبلی کیشنز، کراچی، ۲۰۱۸ء ص ۷

شاعرؔ صدیقی کی غزل گوئی

غزل اُردو شاعری میں روح کی مانند ہے۔ یہ دراصل قصیدے کا ابتدائی حصہ تشبیب ہے جو عموماً عشق ومحبت کے مضامین پر مشتمل ہوتا ہے۔ ایک الگ صنف سخن کے طور پر ایرانی شعرا نے اس کو رواج دیا عربی زبان میں غزل نام کوئی شعرِ صنف موجود نہیں ہے۔ شمس رازیؔ نے غزل کی تعریف کچھ اس طرح کی کہ ہرن کو جب شکاری کتے دبوچ لیتے ہیں اور بے بسی کی حالت میں اس کے منہ سے جو کرب ناک چیخ نکلتی ہے وہ غزل ہے۔ معلمین ادب نے اب تک غزل کی جو تعریفیں کی ہیں ان میں سب سے مقبول تعریف یہ ہے کہ ''عورتوں سے باتیں کرنا، عورتوں کے متعلق باتیں کرنا، عورتوں سے عشق بازی کرنا''۔ عربی زبان میں غزل سے مراد ''کاتنا'' لیا جاتا ہے۔ عرب میں نوجوان لڑکیاں گھر کی مصروفیت سے جب فارغ ہوجاتی سوت کاتتی تھی اور جو گیت گھاتی اس کو غزل سے معنون کیا جاتا تھا۔ شاعری کی اصطلاح میں غزل وہ شعری صنف ہے جس کے ہر شعر میں الگ مضمون باندھا گیا ہو جامعیت اور اختصار غزل کے ہر شعر کا خاصہ ہوتا ہے غزل کا ہر شعر اپنے مفہوم کے لحاظ سے سالم ہوتا ہے۔ عشق و عاشقی کے مضامین غزل کے بنیادی عناصر سمجھے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر محمد عبدالحفیظ قتیلؔ نے اس حوالے سے کچھ یوں اظہار خیال کیا ہے:

> ''غزل کے لغوی معنی عورتوں سے باتیں کرنے، ان کے ساتھ خوش طبعی سے پیش آنے اور عاشقی کرنے کے ہیں۔ اور اصطلاح میں اس صنف سخن کو کہتے ہیں جو حسن جمال کی تعریف اور عشق و عاشقی کے ذکر کے لیے مخصوص ہے''(۱)

ہیئت کے اعتبار سے غزل کے تمام مصرعے ایک ہی وزن و بحر میں ہوتے ہیں۔ ہر شعر مفہوم کے اعتبار سے دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ اشعار کی تعداد کم از کم پانچ سے سات ہونی چاہیے۔ غزل کے پہلے شعر کو مطلع کہتے ہیں جس کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں باقی اشعار کے آخری مصرع قافیہ کا

التزام ضروری ہوتا ہے آخری شعر کو مقطع کہا جاتا ہے جس میں شاعر اپنا تخلص لاتا ہے۔علاوہ ازیں ردیف کا استعمال بھی غزل میں کثرت سے ہوتا ہے۔مذکورہ بالا عناصر غزل کے بنیادی اجزائے ترکیبی سمجھے جاتے ہیں۔

غزل کی ابتدائی سوتے سرزمین ایران سے پھوٹے ہیں۔اُردو ادب کے دیگر اصناف سخن کی طرح اُردو میں غزل بھی فارسی ادب سے وارد ہوئی ہے۔اُردو شعری ادب میں جو مقبولیت صنف غزل کے حصے میں آئی ہے کسی اور صنف کو نصیب نہیں ہوئی۔اُردو کے تقریباً تمام معتبر شعرا نے غزل میں طبع آزمائی کی ہے بلکہ اکثر شعرا ایسے ہیں جن کے نام صرف غزل کی وجہ سے زندہ جاوید ہے۔ریختہ میں غزل کے جو قدیم ترین نمونے دریافت ہوئی ہیں وہ امیر خسرو کے ہیں۔جس کی زبان فارسی اور ہندی کی اختلاط پر مشمل ہیں جو غزل کی ہیت سے مشابہہ ہیں۔ڈاکٹر سعداللہ کلیم رقم طراز ہیں:

> ''اُردو غزل عربی آمیز فارسی کے زیر اثر وجود میں آئی اور اس کے ابتدائی نقوش ان ریختوں کی صورت میں محفوظ ہیں جن کا ایک مصرعہ فارسی اور ایک ہندی زبان کا ہے اور یہ بھی مان لیا جائے جیسے کہ موجود مواد کا تقاضا ہے، کہ قدیم ترین ریختہ جو غزل کی ہئیت پر پورا اترتا ہے وہی ہے جو امیر خسرو سے منسوب ہے(۲)

قیام پاکستان کے بعد اُردو غزل گو شعرا کی بڑی تعداد منظر عام پر موجود ہے۔جنہوں نے اثاثۂ اُردو غزل میں بیش بہا اضافہ کیا ہے۔ان شعرا نے عموماً لب ورخسار،گل وبلبل،مینا وجام اور محبوب جیسے روایتی تصورات کے بجائے تہذیبی وسماجی عوامل کی عکاسی کی ہے۔اس نئی نسل کے شعرا نے نئے خیالات کے اظہار کے لیے نئی علامات نئے لفظیات اور نئے تصورات کو غزل میں جگہ دی ہے۔اس دور کی غزل کا رشتہ ہمارے تہذیبی ومعاشرتی مزاج سے بڑی حد تک جڑا ہوا ہے۔

عصر حاضر کے قابل ذکر شعرا میں سے ایک نام شاعرؔ صدیقی کا بھی ہے۔جنہوں نے اپنے ہم عصر شعرا میں نمایاں مقام حاصل کیا ہے۔شاعرؔ صدیقی اُردو ادب کے ایک کہنہ مشق شاعر ہیں جن کا شعری سفر تقریباً سات دہائیوں پر پھیلا ہوا ہے۔انہوں نے اپنی غزل میں ذاتی حالات کے علاوہ اپنے عہد کی تہذیب ومعاشرت کا بھرپور نقشہ کھینچا ہے۔شاعرؔ صدیقی کی شاعری کے معیار پر بات کرتے ہوئے

شاعر علی شاعرؔ یوں لکھتے ہیں:

''اگر شاعرؔ صدیقی اوران کے ہم عصروں کے کلام کا موازنہ کیا جائے تو شاعرؔ صدیقی کے معیار کا پلہ بھاری رہے گا ان کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ شاعر صدیقی اپنے ہم عصروں کی طرح دولت، شہرت یا عیاشی کے پیچھے نہیں بھاگے اور نہ ہی کبھی اُنھوں نے مشاعروں میں شرکت کے لیے مشاعرہ انتظامیہ کی چاپلوسی کی۔ وہ اپنی سچی تخلیق میں ہمہ تن مصروف رہے اوران کا کلام سفر کرتا رہا'' (۴)

شاعرؔ صدیقی ایک ہمہ جہت شخصیت ہیں جنہوں نے حمد، نعت، غزل، نظم، گیت، دوہا، قطعات کے علاوہ رباعیات میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ اُن کا کلام اپنے منفرد اسلوب کے بنا پر بے حد مشہور ومقبول ہے۔ شاعرؔ صدیقی نے اپنی شاعری میں حقیقت کی ترجمانی کی ہے۔ شاعرؔ صدیقی کی غزل فکری تناظر میں کثیر الجہت موضوعات پر مبنی ہے۔ اس میں دردوغم، ہجرت، سقوط ڈھاکا، عظمت انسان، رجائیت، جمالیاتی رنگ، عزم وانقلاب، فریب دنیا، بے ثباتی حیات، احساس تنہائی، روایت پسندی اور حقیقت نگاری بنیادی طور پر نمایاں ہیں۔

دردوغم

غم انسانی زندگی سے جڑا ہوا وہ حصہ جس سے کبھی بھی انسان فراغ حاصل نہیں کرسکتا ہے۔ شاعری اور غم کا ہمیشہ سے چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔ شعراوادبا نے اپنے اپنے طرز فکر کے موافق غم کا تصور پیش کیا ہے اور اپنے گہرے احساس کی بدولت معاشرے میں اُبھرنے والے واقعات وحوادث کا احاطہ کرتے ہوئے اپنے خارجی اور داخلی دُکھ درد کا اظہار کیا ہے۔ ادب سماج وماحول سے کسی نہ کسی صورت میں تلخ وشریں اثرات ضرور اخذ کرتا ہے۔ گویا شاعری اس عہد کی سماجی اور معاشرتی تصویر ہوتی ہے جس میں وہ لکھی جاتی ہے۔ دُکھ درد ادبیات کا ایک ایسا موضوع رہا ہے جس کا بھرم تقریباً تمام شعراوادبا نے رکھا ہے۔ دردوغم کے جذبات شاعری میں تاثیر کے محرک بنتے ہیں۔ پروفیسر انور جمال شاعری میں دردوغم کی اہمیت پر اظہار خیال کرتے ہوئے یوں تحریر کرتے ہیں:

''ادبیات عالم کے عظیم فن پارے وہ ہیں جن کی رگوں میں PATHOS کی لہریں ہیں افسردگی کی ہلکی ہلکی آنچ، دھیما دھیما لہجہ اور نرم سلگاؤ کا عمل شعر کو موثر بنانے کے مضامین ہیں'' (۵)

شاعرؔ صدیقی کی ساری زندگی رنج والم، دُکھ درد اور مصیبتوں سے عبارت ہے۔ وہ ایک درد منداور حساس شخصیت کے مالک ہیں اس لیے ان کے ہاں درد وغم کے عناصر کچھ کم نہیں ہیں۔ ان کی غزل تحریک پاکستان اور ہندو مسلم فسادات سے لے کر سانحہ مشرقی پاکستان تک کے درپیش حوادث اور واقعات کا احاطہ کرتی ہے۔ انہوں نے اپنی زندگی کی کہانی کو غم کا روپ دے کر پیش کیا ہے۔ ان کی حیات کی تلخی زندگی بھر ان کی زباں پر رہی ہے۔ وہ اپنے طویل شعری سفر میں جہاں جہاں ذہنی اذیت اور معاشرتی و سماجی کرب سے گزرے وہ سوز و گداز اور تلخی ان کی غزل میں جا بجا نظر آتی ہے۔ امیر حسین چمنؔ ان کے شعری مجموعہ ''آنکھوں میں سمندر'' میں اس حوالے سے یوں اظہار خیال کرتے ہیں:

''زیر نظر مجموعہ کلام میں شامل ان گنت اشعار آپ کو ایسے ملیں گے جس میں شاعر کے لہولہان احساس کی دردنا کی قاری کی آنکھوں میں دکھ کی نمی بن کر ستاروں کی طرح جھلملانے لگتی ہے اور بعض جگہ احساس کی طغیانی اور شدت جذبات سے لفظ لرزتے اور کانپتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں'' (۶)

شاعرؔ صدیقی نے اپنے کلام میں درد وغم کا اظہار بہت دل گداز اور منفرد انداز میں کیا ہے۔ بطور نمونہ چند اشعار دیکھیے:

تمہارا غم جو ملے گا غم زمانہ سے
مئے حیات کو دو آتشہ بنا دے گا
(۷)

میں نے ہر درد کو پہلو میں دبا رکھا ہے
ضبط کا میرے بھرم دیدۂ گریاں رکھنا
(۸)

کچھ اس طرح سے غم زندگی گوارا کیا
جو اشک آنکھ میں آیا اسے شرارہ کیا
(۹)

مجھ سے شاید غم دوراں کا پتہ مل جائے
دیکھئے مجھ کو کہ حالات کی تصویر ہوں میں
(۱۰)

شاعرؔ صدیقی کے ہاں غم دوراں کے ساتھ ساتھ غم جاں کے تذکرے بھی نہایت دل فریب انداز میں ملتے ہیں۔لیکن ان تذکروں سے ایسا لگتا ہے کہ انہوں نے بھی فیض احمد فیضؔ کی طرح غم جاناں کو غم دوراں کے مقابلے میں زیادہ اہمیت کا حامل نہ سمجھا۔ان کی غزلوں میں ہجر وفراق، بے وفائی اور شب تنہائی جیسے موضوعات کثرت سے موجود ہیں:

غمِ دنیا ، غمِ عقبیٰ ، غمِ جاناں
انھی خانوں میں میرا دل بٹا ہے
(۱۱)

تمہارے غم بھی بہر طور جھیل جائے گا
ہے مجھ کو ناز بہت غم سے آشنا ہے دل
(۲۱)

شاعرؔ صدیقی کی غزلوں میں غم دوراں اور جاناں کا ایک حسین امتزج بھی ملتا ہے۔ان کی غزل اس تہذیب ومعاشرت کی کھلی تصویر ہے جس میں وہ اپنی زندگی کی شب وروز بسر کر رہے ہیں۔حالات اور ماحول کے گہرے اثرات نے ان کی جذباتی کیفیت کو جلا بخشی جو ان کی غزل میں سوز وگداز کے محرک بنے۔شاعرؔ صدیقی وہ شخصیت ہیں جنہوں نے دو ہجرتوں کے دکھ برداشت کیے ہیں۔دوسری ہجرت ان کے لیے ایک ایسا سانحہ ہے جن کے کرب انگیزی ان کے ذہن پر ساری زندگی سوار رہی ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کی زبان پر یہ تلخی ہمیشہ رہی ہے۔

ہجرت

شاعرؔ صدیقی دو ہجرتوں کے اہل قلم میں سے ایک معتبر نام ہے۔اُن کے ہاں یہ موضوع کافی اہمیت کا حامل ہے۔اُن کی غزل کا بیشتر حصہ ہجرت کے گرد گھومتا نظر آتا ہے۔انھوں نے اپنی زندگی کا زیادہ حصہ مشرقی پاکستان میں گزارا تھا شاید یہی وجہ ہے کہ اس خطے سے ان کا فطری لگاؤ تھا جس کا دکھ درد ان کے کلام میں محسوس کیا جاسکتا ہے۔اس عہد شباب میں شاعر صدیقی کی شعری بصیرت بام عروج پر تھی اور وہ اپنے بلند پایہ تخلیق پاروں کے بنا پر سارے ملک میں مشہور و مقبول ہو گئے تھے۔بدقسمتی سے اچانک ڈھاکا پامال ہو گیا اور انہیں ایک بار پھر سے رخت سفر باندھنا پڑا اور وہ بہت مشکل حالات سے گزر کر نیپال سے ہوتے ہوئے کراچی پہنچے۔اصل وجہ یہی ہے کہ دوسری ہجرت کا دکھ انہیں زندگی بھر رہا ہے کیوں کہ ان کا گھر بار لٹ گیا اور بے سروسامانی کی حالت ایک دفعہ پھر ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے۔اس ضمن مین محمود اختر خان یوں لکھتے ہیں:

> ''اسی دوران اُن (شاعرؔ صدیقی) کی شاعری سانحۂ مشرقی پاکستان کے گرد گھومتی نظر آتی ہے مگر بہت جلد وہ خود کو سنبھالتے ہیں لیکن افسوس پاکستان میں آتے ہی امریت کے اثرات سے دل برداشتہ ہو کر زندگی گزارنے لگتے ہیں اور جمہوریت کا مسخ چہرہ دیکھ کر دل ہی دل میں کڑھتے ہیں،امریت سے جان چھوٹتی ہے تو پاکستان میں سیاسی ولسانی نامساعدہ حالات کے واقعات ان کے دل وروح کو گھائل کر دیتے ہیں۔''(۱۳)

شاعرؔ صدیقی کے لیے وطن چھوڑنا کسی بڑے سانحے سے کم نہ تھا کیوں کہ وہ ایک حساس طبیعت کے مالک ہیں اس لیے ان کے اردگرد جو کچھ ہو رہا تھا وہ گہرائی سے محسوس کر رہے تھے۔انہوں نے سقوط ڈھاکا کے وہ دردناک حالات بہت قریب سے دیکھے اور اشعار میں سموئے۔شاعر صدیقی کے مجموعہ کلام میں بیشتر اشعار ایسے ہیں جن کو پڑھ کر آنکھیں پرنم ہو جاتی ہیں۔اس حوالے سے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

گھر کی تقسیم جب ہوئی شاعر
اپنی قسمت میں بے گھری آئی
(۱۴)

نہ جانے کون سی رت میں چلے تھے ہم شاعرؔ
نصیب پھر نہ ہوا اپنے گھر قدم رکھنا
(۱۵)

ہوئی جو شام پرندے بھی لوٹ کر آئے
میں کن رتوں میں چلا تھا سدا سفر میں رہا
(۱۶)

اس زمانے میں شاعرؔ صدیقی پر مشرقی پاکستان میں کئی الزامات لگائے گئے ان میں سے ایک یہ کہ وہ ڈھاکا سے شائع ہونے والے ادبی وثقافتی میگزین ''چترالی'' کے ایڈیٹر تھے، اُردو فلموں کے لیے سکرپٹ اور گیت بھی لکھتے تھے۔ لہٰذا وہ مشرقی پاکستان میں اردو زبان کی ترویج واشاعت کے لیے کام کررہے ہیں۔ اس کے علاوہ اُردو دانشور اور بنگال میں اُردو فلموں کے فروغ کے لیے کام کرنے کی وجہ سے معتوب ٹھہرے۔ شاعرؔ نے اس الزام کو استعارہ بنادیا۔ جس کا اظہار انہوں نے کچھ یوں کیا ہے:

آپ کے در سے ہمیں درد کی خیرات ملی
جس کی قسمت میں نہیں صبح وہی رات ملی
(۱۷)

ہم نے دنیا کے لیے دل کو جلایا شاعرؔ
اور دنیا سے ہمیں غم کی سیہ رات ملی
(۱۸)

شاعرؔ صدیقی کی اس دور کی غزل میں داخلی عناصر کے بجائے زیادہ تر خارجی عناصر پائے جاتے ہیں۔ اس عہد کے سیاسی، سماجی اور معاشرتی حالات کے گہرے نقوش شاعرؔ صدیقی کی شاعری میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ جو کچھ ان پر گزرا اور جو کچھ انہوں نے محسوس کیا ہے۔ شاعرؔ نے نئے نئے واقعات، مشاہدات اور تجربات کو تحریک میں لاکر اپنے شعر کے سانچے میں سموئے جن سے وہ ذہنی وفکری طور پر متاثر ہوئے۔ شاعرؔ صدیقی کہتے ہیں کہ یہ میرے لیے ایک ایسا درد ہے جس نے مجھے دربدر کیا اور اس درد کو میں نے غزل کے پردے میں آشکار کیا ہے۔

عظمت انسان

رب کریم نے اس کائنات میں انسان کو جس احسن تقویم کے شرف سے نوازا ہے اور جو مرتبہ و مقام اور اعزاز بخشا ہے اس سے باقی تمام مخلوقات محروم ہیں کیوں کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے ایسی خوبیوں اور صلاحیتوں سے نوازا ہے جس کی وجہ سے انسان کا مقام و مرتبہ فرشتوں سے بھی بڑا ہے۔

شاعرؔ صدیقی کی غزلوں میں انسان دوستی کا برملا اظہار ملتا ہے۔ انہوں نے ہمیشہ انسان کی عظمت کے ترانے گائے ہیں۔ ابن ادم سے محبت ان کی سرشت میں کثرت سے موجود ہے وہ کہتے ہیں کہ میں اس نفرتوں کی دنیا میں پیار و محبت کا دیا بن کر جل رہا ہوں۔ انہوں نے فلسفۂ انسان پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا ہے کہ انسانی وجود کے لیے دوام ہے۔ یہ کبھی بھی ختم نہیں ہوگا۔ انسانوں کو اس جہاں فانی میں امن و سکون سے رہنے کی تلقین کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ایک دوسرے کا سہارا بنو اور انسانی دُکھ درد کو محسوس کرو کیوں کہ ایک انسان دوسرے کا سہارا ہے اور ہمارے معاشرے میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جن کے دلوں میں انسانیت کے لیے درد نہیں ہے لیکن ہوسِ دنیا اور لالچ کی وجہ سے یہ احساس دب گیا ہے۔ شاعرؔ نے عصر حاضر کے ادیبوں پر بھی طنز کیا ہے کہ ہمارے معاشرے کے بے بس اور غریب طبقہ جن حالات سے گزر رہا ہے وہ توجہ کے قابل ہے لیکن افسوس کہ ہمارے ادیب لوگ اب بھی افسانے لکھنے میں مگن ہیں۔ حقیقت ان کو نظر نہیں آتی۔ ڈاکٹر حنیف فوقؔ لکھتے ہیں:

> ''ان کی غزل انسان کا درد لیے ہوئے ہے۔ دوسروں کے غم سے ان کی آنکھیں بھر آتی ہیں اور اس لیے وہ آنکھوں میں سمندر لیے ہوئے ہیں۔ وسیع انسانیت کے غم کو شاعر نے اپنا غم سمجھا ہے اور اسی سے ان کی شاعری کا لہجہ متعین ہوا ہے'' (۱۹)

شاعرؔ صدیقی ایک حساس اور دردمند دل رکھتے ہیں ان کے غزلوں میں ایسے اشعار اچھی خاصی تعداد موجود ہیں جن میں انسانی عظمت کا اظہار پُر تاثیر لفظوں میں ملتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجئے۔

لوح محفوظ پر لکھی ہوئی تحریروں میں
ڈوب سکتا نہیں ظلمت میں کہ تنویر ہوں میں

میں نے انسان کی عظمت کے ترانے گائے
سچ کہا آپ نے لائق تعزیر ہوں میں
(۲۰)

ابن ادم کی نئی نسل پر احسان رکھنا
امن کی شمع بہر طور فروزاں رکھنا
(۲۱)

اس حسین وادی میں نفرتوں کے آندھی میں
جل رہے ہیں ہم تنہا پیار کا دیا بن کر
(۲۲)

شاعرؔ نے موجودہ عہد کے حکمران طبقہ پر بھی نشتر برسائے ہیں کہ وہ اقتدار کے نشے میں انسانوں کے دکھ درد کا احساس نہیں رکھتے بلکہ ان کا استحصال کرتے رہتے ہیں۔ شاعرؔ صدیقی سمجھتے ہیں کہ اگر کوئی انسانیت کی خاطر اپنی جان کا نذرانہ پیش کریں تو اس کی یہ موت زندگی سے کئی گنا بہتر ہے:

اے شیش محل کے شہزادو، انسان کی عظمت کو سمجھو
انسان کے بس میں سب کچھ ہے، یہ کہکشاں یہ شمس وقمر
(۲۳)

وہ موت جس میں معراج آدمیت کی
وہ موت زیست سے پیاری ہے زندگی کی قسم
(۲۴)

مہر و اخلاص کا دامن نہ کبھی چھوڑ سکا
اپنے بچپن کا سبق یاد ہے ازبر جیسے
(۲۵)

شاعرؔ کی غزلوں میں ایسے اشعار کافی تعداد میں ملتے ہیں جن میں انہوں نے انسانی عظمت اور

انسان سے اپنی بے پنا محبت کا اظہار کیا ہے۔شاعرؔ صدیقی نے میر دردؔ کی طرح انسان کو فرشتوں پر فوقیت دی ہے اور وہ اس بات کو اپنے ایمان کا حصہ سمجھتے ہیں کہ انسان کو فرشتہ کہنا مناسب نہیں ہے کیوں کہ انسان کا مقام و مرتبہ دراصل میں فرشتوں سے بڑا ہے اس لیے کہ انسان بننا اس کہیں زیادہ مشکل ہے۔وہ انسانی فطرت پر بات کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ انسان اچھائیوں اور برائیوں کا مجموعہ ہے انسان مکمل طور پر بُرا نہیں ہوسکتا اس میں اچھائیاں بھی بہت ہوسکتی ہیں۔

شاعرؔ صدیقی ایک ایسے معاشرے کی تلاش میں ہیں جہاں نفرتوں کے بجائے محبتوں اور دشمنوں کے بجائے مسیحاؤں کا راج ہو جہاں امن، آشتی اور انسان سے محبت کا بھرم رکھا جاتا ہو۔وہ معاشرے میں انسانیت کے فروغ کے خواہاں ہیں۔وہ تمام انسانوں کو بھائی بھائی سمجھتے ہیں لیکن انہیں اس بات کا گہرا افسوس ہے کہ ہم ایک دوسرے کے ساتھ وہ سلوک کرنے پر آمادہ ہیں جو یوسفؑ کے ساتھ ان کے بھائیوں نے کیا تھا۔وہ سمجھتے ہیں کہ ہم زمیں پر خود جینے کی خواہش تو رکھتے ہیں لیکن دوسروں کو جینے نہیں دیتے، اپنے گھروں کو آباد کرنے کے لیے اوروں کے گھروں کو اُجاڑتے ہیں۔

شاعرؔ صدیقی کی غزل کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوجاتی کہ وہ انسان کی عظمت کے قائل ہیں اوروں کے دکھ درد کو وہ اپنا غم سمجھتے ہیں اور ساتھ وہ انسان کی عظمت کو سمجھانے کا درس بھی دیتے ہیں۔ انہیں اس بات کا بڑا دکھ ہے کہ وہ ایک ایسے معاشرے کے باسی ہیں جہاں کے مکیں انسان کی قدر و منزلت سے غافل ہیں۔شاعرؔ کی غزل کو جس چیز نے بلند وارفع کردیا ہے وہ انسانی عظمت کا فکری رجحان ہے۔

رجائیت پسندی

''رجا'' عربی زبان کا لفظ ہے جس کے لغوی معنی ''اُمید'' کے ہیں۔اس کے ساتھ ''یت'' بطور لاحقہ لگا کر جس سے اُمید و بیم کی کیفیت ظاہر ہوتی ہے۔شعری اصطلاح میں ''رجائیت'' سے مراد ادب میں مختلف واقعات و حالات، کے متعلق پُر امید خیالات کا اظہار کرنا ہے۔پروفیسر انور جمال رجائیت کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''شاعری میں خاص طور پر ایسے موضوعات اختیار کرنا جس سے عزم، ولولہ، حوصلہ اور اُمید کے جذبات پیدا ہوں رجائیت ہے''(۲۶)

رجائیت عموماً قومی ادب کے لیے ایک ضروری عنصر سمجھا جاتا ہے۔ معلمین ادب نے اس کی دو اقسام بیان کی ہیں ایک رجائیت مجہول ہے جس میں شاعر یا ادیب غیر متحرک طور پر نامساعدہ حالات کو خود سے بدلنے کا منتظر ہوتا ہے۔ دوسری قسم فعال رجائیت ہے جس کا کردار مستقبل میں بہتری لانے کے لیے ایک عزم اور ولولہ کے ساتھ کوشش میں مگن رہتا ہے۔ اُردو ادب کے دیگر شعرا کے مقابلے میں علامہ اقبال کے ہاں یہ رجحان زیادہ غالب نظر آتا ہے۔

رجائیت پسندی بھی شاعرؔ صدیقی کی شاعری کا ایک امتیازی وصف ہے۔ انہیں ساری زندگی مصائب اور مشکلات کا سامنا رہا ہے۔ لیکن وہ کبھی بھی اپنی زندگی سے مایوس نہیں ہوئے۔ یہ اُن کی شخصیت کا مثبت اور منور پہلو ہے جو ان کے ہاں جا بجا جلوہ گر ہے جس سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ وہ ایک بلند پایہ شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک پر امید انسان بھی ہیں جنہیں باری تعالیٰ کی ذات پر کامل یقین ہے اس لیے زندگی کے مصائب و آلام سے دل برداشتہ نہیں ہوتے۔ اس حوالے سے اکرم کنجاہی یوں رقم طراز ہیں:

> ''ان کے ہاں رجائیت کا فقدان نہیں ہے۔ رجائیت ایک مثبت انداز فکر اور شعری خوبی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ رجائیت اُن کے مزاج کا خاص حصہ ہے اور محض تصنع اور ستائش کے لیے کلام میں نہیں ہے۔ خوش فکری کو کلام میں زبردستی سے مسلط نہیں کیا گیا ہے'' (۲۷)

شاعرؔ صدیقی مسلسل دو ہجرتوں کے کرب سہنے کے بعد بھی وہ زندگی سے دل برداشتہ نہیں ہوئے ہیں۔ وہ کامل یقین کے ساتھ ایک درخشاں مستقبل کے لیے پُر امید ہیں۔ وہ اس بات کو سمجھتے ہیں کہ تیرگی کا راج تا ابد قائم نہیں رہتا۔ روشنی آنے میں دیر تو لگتی ہے لیکن آتی ضرور ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ایک نئی صبح کا آغاز ہو رہا ہے اور ظلمت شب کا طلسم ٹوٹنے کو ہے جس کے سبب لوگ مصائب و آلام، ظلم اور بربریت کے شکار تھے۔ جو لوگ غفلت کی نیند سو رہے تھے ان کے جگانے کا وقت آن پہنچا ہے۔ شب پرستوں کی زبانیں بند رہ جائیں گی کیوں کہ اندھیرے کا جگر چاک ہونے کو ہے۔ اس ضمن میں چند اشعار ملاحظہ ہوں:

نظر نظر میں فروزاں تھے جو چراغ اُن سے
سیاہ شب کا جگر چاک ہو گیا کہ نہیں
(۲۸)

یہ جشن تیرہ شبی صبح کو صدا دے گا
اندھیرے خود نئے سورج کو راستا دے گا
(۲۹)

پیدا نئی سحر کے آثار ہوگئے ہیں
جو لوگ سو رہے تھے بیدار ہوگئے ہیں
(۳۰)

طلسم ظلمت شب ٹوٹنے کو ہے شاعرؔ
سحر کا جلوہ ذرا آنکھ مل کے دیکھو تو
(۳۱)

شاعرؔ صدیقی کے ہاں آس واُمید پوری آب وتاب کے ساتھ نمایاں ہے۔ یہ اُن کی شاعری کا ایک تعمیری اور روشن پہلو ہے۔ انہوں اپنی غزلوں میں قنوطیت سے دامن چھڑانے کی بھرپور کوشش کی ہے جس سبب سے ان کی غزل ایک سنگ میل اور نشان راہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جب معاشرے میں ظلم وستم حد سے بڑھ جائے تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ صبح نو اور شبِ غم کی بیچ کا فاصلہ ختم ہونے کو ہے۔ وہ اپنی غزلوں میں اس بات کا درس بھی دیتے ہیں کہ جس طرح خزاں کے بعد بہار کی آمد ہوتی ہے، اسی طرح سیاہ رات ایک منور صبح اپنے ساتھ لے آتی ہے غم کے بعد خوشی کا آنا، کھٹن اور مشکل حالات ایک خوش کن مستقبل میں بدلتے ہیں۔ ایسا وقت آتا ہے جو دل کے گہرے زخموں کو بھر دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں شبیر ناقد یوں لکھتے ہیں:

''شاعر مذکورہ کا ایک فطری اعجاز یہ بھی ہے کہ ان کا حزن والم یاسیت آمیز نہیں بلکہ ان کے ہاں لطیف احساسات کی بارہ دری بھی ہے جس سے باد نوبہاری کے تازہ جھونکے اقلیم وخرد کو معطر ومعنبر کرتے ہیں انہوں نے ایک خوش گوار شعری روایت کو پروان چڑھانے کی سعی بلیغ کی ہے رنج وملال کا بیان طربیہ پیرئیہ اظہار میں انتہائی خوش آئند ہے'' (۳۲)

شاعرؔ صدیقی کے ہاں انفعالیت کے بجائے فعالیت نمایاں ہے۔ وہ خود سے حالات بدلنے کے قائل نہیں ہیں بلکہ جِد وجُہد پر یقین رکھتے ہیں۔شاعرؔ صدیقی کے ہاں زندگی کا ایک پُر اُمید اور خوش آئین مستقبل کا تصور موجود ہے۔ جوان کی شخصیت میں، جواں مردی، بلند حوصلہ، عزم، اور ذہنی آزادی کا ایک واضح ثبوت مہیا کرتا ہے۔

جمالیاتی رنگ

جمال کا لفظ عربی زبان سے ماخوذ ہے جس کے لغوی معنی حسن اور خوب صورتی کے ہیں۔ اصطلاح میں جمال کی کلیت یعنی جمالیات فنون لطیفہ کا وہ علم جس میں حسین چیزوں کے جانچنے اور پرکھنے کے اصول وضوابط کے متعلق بحث ہوتی ہے۔ادبیات عالم میں یہ اصطلاح پہلی مرتبہ ایک جرمن فلسفی بام گارٹن نے ۱۷۵۰ء میں استعمال کی جس سے علم حسیات مراد لیا۔ جمالیاتی فلسفے کی ترقی میں بام گارٹن کے جمالیاتی تجزیے کو ایک اہم موڑ کے طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔اس سے پہلے لفظ ''جمالیات'' قدیم مصنفین کے استعمال میں ''حساسیت'' یا ''حواس'' کے ردعمل کے طور پر سمجھا جاتا تھا۔جدید نظریے کے مطابق جمالیات وہ فلسفہ ہے جو نقد ونظر تجربہ حسن اور تخلیقی تجربہ کے قدر ومعیار کے متعلق بحث کرتی ہے۔ بحر حال علمائے ادب نے اب تک جمالیات کی جتنی توضیع وتشرح کی ہے اس سے لفظ جمالیات کی حتمی تعریف سامنے نہیں آتی۔

حسن پرستی انسان کی فطرت ہے۔کائنات میں جہاں بھی خوبصورتی کو دیکھتا ہے اس سے روحانی طور پر متاثر ہوتا ہے۔اُردو کے تقریباً تمام اکابر شعرا کے ہاں جمالیاتی رجحان موجود رہا ہے۔

جمالیات شاعرؔ صدیقی کی شاعری کی اہم خصوصیت ہے ان کی غزل جمالیاتی حس سے معمور ہے۔ان کی ہاں حسن کی ہمہ گیری نظر آتی ہے۔اس جمالیاتی رجحان نے ان کے کلام میں جاذبیت اور اثر آفرینی پیدا کی ہے۔انہوں نے اپنی غزل کو سوقیانہ پن اور ابتذال سے محفوظ رکھا ہے۔جس کی وجہ سے ان کی جمالیاتی فکر میں تقدس اور پاکیزگی پیدا ہوگئی ہے۔ان کے ہاں روایتی انداز میں گل وبلبل، لب ورخسار اور قدرعنا جیسے مضامین کا اظہار ملتا ہے۔ ان کو اپنا محبوب چاند اور کنول سے بھی خوبصورت نظر آتا ہے۔ جب وہ خوبصورت چہروں، رسیلے ہونٹ اور پیار بھرے شرمیلے نین دیکھتے ہیں تو ان کی نیندیں اُڑ جاتی

ہے۔کبھی وہ محبوب کی خوبصورتی گل وبلبل میں تلاش کرتے ہیں تو کبھی اس کے لہجے کی مٹھاس کو خط کے لفظوں میں محسوس کرتے ہیں اور کبھی اس کے بانہوں میں مرجانے کی خواہش رکھتا ہے۔جب وہ اپنے محبوب کی شوخ اور چنچل آنکھیں یاد کرتے ہیں تو ان پر بے خودی طاری ہوجاتی ہے اور جب ساتھ ہوتا ہے تو وہ چاند کو رات کے ماتھے پہ جھومر سمجھتا ہے ان کو کائنات کی ہر چیز حسین لگتی ہے۔اُن کے کلام میں رعنائی اور لطافت بالکل فطری طور پر نمایاں ہے۔اس حوالے سے اکرم کنجاہی یوں رقم طراز ہے:

> ''اُن کے غزلیہ دشت میں چوکڑے بھرتے ہوئے آہوؤں،غزالوں اور آہو چشموں کی کمی نہیں۔کئی ایک غزلیات مکمل طور پر جمالیاتی رنگ میں کہی گئی ہیں۔یہ ان کے جذبے اور شدت احساس کی نہیں فکر وخیال افروزی کی کارفرمائی لگتی ہے۔ایسی مسلسل غزلیات کی تعداد ان کے کلام میں کم نہیں۔مسلسل غزل کا ان کے ہاں ورود وحدت تاثیر پیدا کرتا ہے''(۳۳)

جمالیاتی تناظر میں شاعرؔ کے ہاں ایسے نمونے موجود جنہیں پڑتے ہی قاری پر اپنا سحر طاری کردیتے ہیں۔چند اشعار ملاحظہ ہو:

اس کی صورت کی بدل چاند ستارہ نہ کنول
اس کے لہجے کی کھنک گیت، رباعی نہ غزل
(۳۴)

خط کے لفظوں میں رچی ہے ترے لہجے کی مٹھاس
دل میں دھڑکن کی طرح، پھول میں خوشبوں کی طرح
آج بھی راہ دکھاتی ہیں وہ آنکھیں مجھ کو
ظلمت شب میں چمکتے ہوئے جگنو کی طرح
(۳۵)

جنم لینے لگی ہیں کچھ عجب سی خواہشیں شاعرؔ
کسی کی مرمری بانہوں میں مرجانے کو جی چاہا
(۳۶)

شاعرؔ صدیقی کی بعض غزلیں ابتدا سے آخر تک ایک خاص جاذبیت اور دل چسپی رکھتی ہے۔ جو قاری کی طبیعت پر بوجھ کا باعث نہیں بنتی۔ مثال ملاحظہ ہو:

ہمارے شہر میں کچھ حسن خال خال نہ تھا
مگر یہ سچ ہے کسی میں ترا جمال نہ تھا
میں آ گیا جو تمہاری حسین آنکھوں میں
کمال عشق تھا مرا کوئی کمال نہ تھا
(۳۷)

ایک اور مثال ملاحظہ ہو:

ہم نے دیکھی ہیں وہ کافر آنکھیں
کتنی چپ چاپ سخنور آنکھیں
ڈوب جاؤں تو ابھرنا مشکل
جھیل آنکھیں وہ سمندر آنکھیں
(۳۸)

وہ حسن کو کائنات میں تلاش کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کے اشعار ایک شدید جذبے کے ساتھ ان کے جمالیاتی فکر کے مظہر ہیں۔ شاعرؔ نے محبوب کے حسن و جمال اور رعنائی کے جس طریقے سے تصویر کشی کی ہے وہ لاجواب ہے:

گلاب ہونٹوں کی چنگاریاں مجھے دے دو
رہ حیات میں تاریکیاں تو ہوتی ہے
(۳۹)

وقت رخصت وہ نگاہوں میں ایک افسانہ شوق
اشک وہ عارض گلنار پہ ڈھلکا ڈھلکا
(۴۰)

عصرِ حاضر میں شاعرؔ صدیقی کو اگر ایک جمال دوست شاعر کے لقب سے نوازا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ حسن ان کے رگ و پے میں بسی ہوئی ہے۔ ان کی شاعری میں جمالیاتی حس اپنی پوری آب تاب سے نمودار ہے وہ محبوب کی خوبصورتی کا ذکر ایسے مؤثر انداز سے کرتے ہیں کہ قاری تحسین و آفرین دئے بنا نہیں رہ سکتا۔ شاعرؔ صدیقی کی شاعری کو دلکشی، نغمگی اور جمالیاتی حسن نے چار چاند لگا دئے ہیں۔ انہوں نے سادگی، اعتدال اور پختگی سے اپنی داخلی جذبات کا اظہار کرنے کے ساتھ روایت کا بھرم بھی رکھا ہے جس سے ان کی شخصیت کا جمالیاتی گوشہ بے نقاب ہوگیا ہے۔ ان کی شاعری پر جمالیاتی رجحان چھایا ہوا ہے۔ ان کی زندگی دو ہجرتوں کے کرب کے علاوہ دیگر سماجی، معاشرتی اور معاشی دکھوں سے بھی مملو ہے لیکن اس کے باوجود انہوں نے اپنی جمالیاتی فکر کے ساتھ الفاظ کی ترتیب و نشست کا بھی پاس رکھا ہے جو ان کی فنی و فکری پختگی کا ثبوت بہم پہنچاتی ہے۔

عزم و انقلاب

عزم کے لغوی معنی قصد یا ارادے کے ہیں جبکہ انقلاب زمانی گردش، تبدیلی اور تغیر کا نام ہے۔ شاعر اور تخلیق کار عموماً حساس ہوتے ہیں اور انہیں اپنے شدید احساسات، جذبات، اور مشاہدات کی بدولت معاشرے میں وہ کچھ نظر آتا ہے جو عام لوگوں کی فہم و فراست اور بصارت سے بالاتر ہوتا ہے۔ اُردو میں ایسے شعرا کی تعداد بہت زیادہ ہے جنہوں نے اپنے عہد کے موافق معاشرتی ناہمواریوں، ظلم و جبر اور غربت و افلاس جیسے مسائل کے خلاف آواز اُٹھائی ہے۔

شاعرؔ صدیقی نے معاشرے کے جابرانہ نظام کے خلاف عزم مستقل اور یقین محکم کے ساتھ آواز بلند کیا ہے۔ وہ اس جابرانہ نظام کو بدلنے کے آرزومند ہیں۔ ملکی ناانصافیاں، بے اعتدالیاں اور ظلم ستم شاعر کے برداشت سے باہر ہے۔ لیکن انہوں نے اپنی انقلابی نعروں میں اخلاقیات کا مظاہرہ کیا ہے۔ اس سلسلے میں پروفیسر ہارون الرشید یوں تحریر کرتے ہیں:

> ''ملک و معاشرے میں پھیلے ہوئے ناانصافیوں، بے اعتدالیوں اور ظلم و ستم پر ان کا دل کڑھتا ہے اور ان کے خلاف آواز کیے بغیر نہیں رہتے لیکن ان کے اشعار نعرہ یا پروپیگنڈا نہیں بنتے بلکہ یہ اشعار بھی شعریت

میں ڈوبے ہوئے اور دل میں اتر جانیوالے ہوتے ہیں'' (۴۱)

شاعرؔ صدیقی کی شخصیت کا ایک اور روشن پہلو عزم وانقلاب ہے۔ وہ آزادی کی قدر و قیمت کو سمجھتے ہیں۔ معاشرے میں عدل وانصاف، مساوات، انسان دوستی اور وطن پرستی کے خواہاں ہیں۔ ان کی غزل انقلابی مزاج کی حامل ہے۔ زندگی کے دکھوں، تکالیف اور مشکلات نہ ان کے حوصلے پست کر سکے نہ انہیں ٹوٹ کر بکھرنے دیا بلکہ انہوں نے اپنا عزم سفر جاری وساری رکھتے ہوئے بلند ہمتی اور اولعزمی کا مظاہرہ کیا ہے۔ اس حوالے سے عشرت رومانی یوں اظہار خیال کرتے ہیں:

''شاعرؔ صدیقی زندگی تلخ حقائق کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر آگے بڑھتے رہے انہوں نے تیزی کے ساتھ بدلتی ہوئی تہذیبوں، قدروں، انسانی رشتوں کی شکستگی، منافقت اور ٹوٹ پھوٹ کو کھلی آنکھ سے دیکھا اپنے وجود کو برقرار رکھ کر نفی میں بھی اثبات کے راستے تلاش کیے اور فکر وفن کی ارتقائی سیڑیوں پر چڑھتے رہے انہوں نے زندگی کے تضادات کو محرک فن بنا کر انسانی رشتوں کو محبت کی مالا میں پرو کے انسان دوستی کا ثبوت دیا اپنی شاعری میں رنگ خوشبو، نغمہ، جھنکار اور غنائیت کے علاوہ نمو کے بے شمار چراغ روشن کیے'' (۴۲)

شاعرؔ ایک ایسی زندگی کے قائل ہیں جو دوسروں کی فلاح و بہبود کے لیے کام آجائے۔ وہ دوسروں کے لیے جینے کے خواہاں ہیں۔ ایثار اور قربانی جیسے رجحانات ان کے کلام میں کثرت سے ملتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم مشعلِ رہ گزار ہیں، ہمارا کام جلنا ہے کیوں کہ ہم شمع کائنات ہیں، ہم دیے جلاتے رہے ہیں اور ہمیشہ جلاتے رہیں گے۔ وہ زندگی کو ایک مٹی کے دیے کی مانند قرار دیتے ہیں۔ رات کی تاریکیوں سے لڑنا اُن کا کام ہے۔ معاشرے میں ظلم و بربریت کے خلاف آواز بلند کرنا اندھیروں کو للکارنا ہم وطنوں کو حوصلہ دینا اُن کا محبوب مشغلہ ہے۔ اس ضمن میں چند اشعار ملاحظہ ہوں:

تیرگی کی آندھیاں رات بھر چلتی رہیں
رات بھر لڑتا رہا، ایک مٹی کا دیا

میں کہ شاعر ہوں مری جنگ ہے ظلمات کے ساتھ
میری ہستی اور کیا، ایک مٹی کا دیا
(۴۳)

ہم مشعل حیات ہے ہم شمع کائنات
شاعر ہمارا کام یہی ہے جلا کریں
(۴۴)

زہے نصیب اندھیروں میں تھا سفر اپنا
لہوجلاتے رہے ہم بھی رات بھر اپنا
(۴۵)

شاعرؔ صدیقی کے ہاں زبان کی تلخی سے اُن کی حیات کے درد و کرب کا اندازہ ہوتا ہے۔انہوں نے دو ہجرتوں کے دکھ سہنے کے باوجود زندگی کو راہ راست پر لانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔زندگی ایک سفر کی مانند کٹ جاتی ہے خوشی اور غم اس سفر میں ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔شاعرؔ صدیقی یہ سمجھتے ہیں کہ یہ بات ایک شاعر کے فرائض میں شامل ہے کہ وہ سوسائٹی میں درپیش مظالم اور ناانصافیوں کے خلاف علمِ جہاد بلند کریں۔حق کا ساتھ دیں اور حق کی آواز بلند کریں اور ہمیشہ حق کی برتری اور فتح کو دیکھیں۔وہ درج ذیل اشعار میں زمانے کو بدلنے کی خواہش رکھتے ہوئے کہتے ہیں:

مجھے دے رہی ہے دعوت تری طرزِ جارحانہ
کہ بساطِ غم الٹ دوں بہ طریقِ باغیانہ
مری آنکھ میں ہیں شعلے،مرے دل میں درد عالم
میں پیمبرِ بغاوت کہ ہوں شاعرِ زمانہ
مرا عزم مستقل ہے، مرا ہے یقین محکم
میں بدل کے ہی رہوں گا یہ نظام جابرانہ
(۴۶)

کبھی خوشی کبھی غم ساتھ ساتھ چلتے ہیں
یہ زندگی بھی گزرتی ہے اک سفر کی طرح
(۴۷)

مری حیات کی تلخی مری زباں پر ہے
یہ اور بات ہے حسن ِبیاں نہیں جاتا
(۴۸)

شاعرؔ صدیقی کے خیال میں معاشرے میں ظلم کرنے والے سے ظلم سہنے والا بڑا مجرم ہوتا ہے کیوں کہ وہ کبھی بھی ظلم کے خلاف آواز نہیں اُٹھاتا۔ شاعرؔ اس حوالے سے مزید کہتے ہیں کہ اگر ہم میں جرأت فغاں ہوتی تو آج ہم جن حالات سے گزر رہے ہیں یہ کبھی نہ ہوتے کیوں کہ ہم میں معاشرتی برائیوں کے خلاف آواز بلند کرنے کی جسارت نہیں ہے۔

مرے وطن کی یہ حالت بھلا کہاں ہوتی
ہمارے دل میں اگر جرأت فغاں ہوتی
(۴۹)

بھول بھی سکتا ہوں کیا اس عہدِ وحشت خیز کو
آشیاں جلتا رہا اور باغباں ہنستا رہا
(۵۰)

جیوں تو ظلم کی آنکھوں میں ڈال کر آنکھیں
ملال کیسا ابھی دوش پر ہے سر اپنا
(۵۱)

شاعرؔ صدیقی نے نوجوان نسل میں جوش وجذبہ بیدار کرنے کے ساتھ ساتھ کوشش اور جہدِ مسلسل کی تلقین بھی کی ہے۔ وہ یہ پیغام دیتے ہیں کہ ہمارا تعلق ایک ایسے پرعزم اور جسارت آفریں قبیلے سے ہے جنھوں نے ساحلوں پر واپسی کی کشتیاں تک جلائی ہیں۔ ہم ایسے دیوانے ہیں جو ہر نوع کے

طوفان سے ٹکرانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ہم اپنے مقصد کو انجام تک پہنچانے میں آخری حد تک جانے کی عادی تھے۔لیکن بدقسمتی سے ہم اب ویسے نہ رہے۔

شاعرؔ صدیقی کی غزلوں میں ایسے اشعار کافی تعداد میں ملتے ہیں جو ان کے عزم و حوصلے اور انقلابی طرز فکر کی ترجمانی کرتے ہیں۔ان کے ذہن میں جو انقلابی کیفیت نمو پا رہی ہے اس میں شور و غوغا کے بجائے اعتدال، اور عمل کرنے کی کوشش پائی جاتی ہے۔وہ اپنا پیغام پہنچاتے ہوئے کہتے ہیں کہ معاشرے میں ظلم و استبداد کا مقابلہ کیا جائے، حق گفتنی، سچائی اور اچھائی کا ساتھ دیا جائے۔

فریب دینا

مکر و فریب ایک ایسی سماجی برائی ہے جس سے دنیا کا کوئی بھی معاشرہ محفوظ نہیں ہے معاشرے کا ہر فرد ضرور کسی نہ کسی صورت اس کا شکار ہوتا ہے۔شاعرؔ صدیقی کے ہاں فریب دنیا اور اپنے دوستوں کے منافقانہ سلوک کا ذکر بھرپور انداز میں ملتا ہے۔ایسا لگتا ہے کہ اس معاملے وہ قدرے مایوسی کا شکار ہو گئے ہیں۔وہ سمجھ رہے ہیں کہ اس دنیا میں کوئی قابل اعتبار نہ رہا۔اس سلسلے میں اکرم کنجاہی یوں رقطراز ہیں:

> ''اُن کا دل اگر تمناؤں سے خالی ہو چکا ہے اور اُمید کا تارا ٹوٹ چکا ہے،
> فلک کی محفل سونی سونی ہے، شام غم تاریک ہے تو اس کا سبب یہی ہے
> کہ مہر و وفا کے بندوں کا دنیا میں کہیں کوئی ٹھکانہ نہیں حسن اسیر دام ہوس
> ہے اور عشق شکارِ رسوائی (۵۲)''

شاعرؔ صدیقی اس بات کو سمجھتے ہیں کہ معاشرہ لالچ اور فریب کا گڑھ بن چکا ہے اب کوئی کسی کے خلوص کا اعتبار میں بھی نہیں کر سکتا کیوں کہ یہاں قدم قدم پر منافقت اور فریب رچ بس گئے ہیں۔یہ دنیا کا ریت بن چکا ہے اب دنیا میں بس یہی ہوتا ہے۔وفا کا بھرم رکھنے والے اس دنیا سے فنا ہو چکے ہیں۔بطور نمونہ چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

قدم قدم پہ دیے ہیں فریب دنیا نے
تیرے خلوص کا ہم اعتبار کیا کرتے
(۵۳)

ملا ہے جو بھی وہی دے گیا مجھے ایک داغ
یہ مرا دل تھا کوئی کاسۂ سوال نہ تھا
(۵۴)

شاعرؔ صدیقی کو اس بات کا بہت دُکھ ہے کہ اُن کے قریبی دوستوں نے بھی انہیں بار بار دھوکا دیا ہے۔ وہ دوست جن پر انہیں کامل اعتماد تھا شاعرؔ کہتے ہیں ضروری نہیں کہ جان لینے والا تیر صرف صف دشمناں کی طرف آیا ہوا ہو بلکہ ایسے دوستوں کی بھی کمی نہیں ہے جو دشمن کا روپ دھار لیتے ہیں اور پیچھے سے وار کرتے ہیں۔ ان خیالات کی عکاسی وہ کچھ یوں کرتے ہیں:

تھے جو محکم قطب نما کی طرح
رخ بدلنے لگے ہوا کی طرح
(۵۵)

غلط کہ تیر صف دشمناں سے آیا ہے
حضور دوست ہی پیچھے سے وار کرتے ہیں
(۵۶)

نام پر دوستی کے پھر شاعر
زخم اک اور کھا لیا ہم نے
(۵۷)

شاعرؔ صدیقی جس معاشرے میں رہ رہے ہیں وہاں کا ہر فرد ظلم اور بربریت کے ساتھ ساتھ خود فریبی اور خود غرضی کا بھی شکار ہیں۔ جہاں وفا، محبت، ایمان اور شرافت سیم وزر کی طرح بکاؤ ہے۔ شاعرؔ کہتے ہیں کہ یہاں اگر میں پیکرِ وفا بن جاؤ تو کوئی فائدہ نہیں۔ کیوں کہ یہاں آستینوں میں سانپ پالنے والوں کی کمی نہیں ہے۔ یہاں پر ظاہر اور باطن ایک بڑے تضاد کا شکار ہے۔

لوگ آستینوں میں سانپ لے کے چلتے ہیں
کیا کرو گے تم شاعرؔ پیکرِ وفا بن کر
(۵۸)

حصارِ ذات میں ہر شخص ہے مقید کیوں
یہ کس مقام پر ہم آگئے ہیں سوچو تو
(۵۹)

شاعرؔ صدیقی کو بعض دوستوں کی طرف سے خلوص اور محبت وعقیدت کا عوض ایک فریب کی صورت میں ملا ہے جس کا اظہار شاعر کے ہاں گہرے صدمے کے ساتھ ملتا ہے شاید یہی وجہ ہے کہ وہ اس معاملے میں قنوطیت کا شکار نظر آتا ہیں۔ اور انہیں دنیا میں قدم قدم پر دھوکا، فریب اور منافقت نظر آتی ہے۔ شاعرؔ ایسے معاشرے کا فرد ہیں جہاں کا ہر آدمی پتھر بن چکا ہے۔ یہاں کسی کو اپنے سود وزیاں کا احساس نہیں ہے۔ جہاں کا مسیحا بھی سیم وزر کے پابند ہے۔

بے ثباتی حیات

زندگی کی بے ثباتی شاعری میں ایک ایسا موضوع رہا ہے جس کا تذکرہ عموماً اُردو کے اکثر شعرا کے ہاں ملتا ہے۔ ہر شاعر نے اپنے اپنے فہم وفراست کے مطابق زندگی کی حقیقت کو بیان کیا ہے۔ کسی نے زندگی کو پانی کا بلبلا کہا ہے تو کسی نے نقشِ آب اور کلی کے تبسم سے تعبیر کیا ہے۔

شاعرؔ صدیقی نے اپنی غزلوں میں کئی خوبصورت رنگ بھر دیے ہیں۔ جس میں آروزئے حیات وجاں کے علاوہ انہوں زندگی کی حقیقی ترجمانی بھی کی ہے۔ انہوں نے حیات وکائنات کی بہت سی سچائیوں کو اپنے اشعار کے روپ میں دکھائے ہیں۔ انہوں نے انسانی زندگی کی حقیقت سے متعلق بہت بہترین انداز میں اشعار کہے ہیں جو ان کے فلسفیانہ اور حکیمانہ ذہن کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ان کے ہاں زندگی کی ناپائیداری اور بے ثباتی حیات کے جذبات بہت لطیف انداز میں ملتے ہیں۔ شاعرؔ کی غزلوں میں انسان کی بے بسی اور زندگی کی ناپائیداری کے مضامین کثرت سے شامل ہیں۔ وہ زندگی میں جن حالات وواقعات سے گزر چکے ہیں اس عہد کا انسان قدم قدم پر زندگی کے کمزور ہونے کا احساس رکھتا تھا۔ خاص کر مشرقی پاکستان میں قتل وغارت گری کے جو واقعات ان کے سامنے گزرے ہیں جس نے شاعرؔ کے دل ودماغ پر گہرا اثر چھوڑا ہے۔ جو انہوں نے شعر کے لبادے بیان کیے ہیں۔

شاعرؔ صدیقی کے ہاں دنیاوی زندگی ناقابل اعتبار ہے شاید یہی وجہ ہے کہ ان کی فطرت میں

غرور، حسد، لالچ اور حرص جیسے جذبات معدوم ہو چکے ہیں۔ وہ ایک ناصح ہونے کی حیثیت سے اس بات پر کامل یقین رکھتے ہیں کہ موت زندگی کے تعاقب میں ہے اور ایک نہ ایک دن اس جہاں فانی سے کوچ کر جانا ہے۔ اس بات کا اظہار انہوں بہت ہی دلکش انداز میں کیا ہے، بطور نمونہ چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

موت ہے زیست کے تعاقب میں
اور میں بھاگ رہا ہوں پیہم

(۶۰)

یہ بھول جاتے ہیں ایک روز خاک ہونا ہے
مزاج رکھتے ہیں شاعرؔ جو عرش پر اپنا

(۶۱)

شاعرؔ صدیقی کے ہاں دنیا کی بے ثباتی کا شدید احساس ملتا ہے۔ انھوں نے اس ضمن میں اپنے صوفیانہ ذہنیت کی ترجمانی بالکل سیدھے سادے اور سلیس انداز میں کی ہے۔ جس سے ان کے قلندرانہ مزاج کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔ اس ضمن میں چند مثالیں ملاحظہ کیجئے:

تمہیں خبر ہے جو طوفان آنے والا ہے
غرور کج کلہی خاک میں ملا دے گا

(۶۲)

کسی کے واسطے یہ وقت کب ٹھہرتا ہے
گزر گیا جو زمانہ پلٹ کے مت دیکھو

(۶۳)

شاعرؔ صدیقی نے یہ بات واضح کر دی ہے کہ زندگی کی قید میں جتنے بھی اسیر ہیں، ایک دن آئے گا کہ یہ سب کے سب رہا ہو جائیں گے اور صرف ان کے نقش و نگار رہ جائیں گے۔ آج جو لمحات میسر ہیں انھیں غنیمت سمجھو۔

ایک دن آخر رہا ہو جائیں گے سارے اسیر
اور در و دیوار پر گل کاریاں رہ جائیں گی

آج جو کچھ ہے غنیمت جانیے شاعرؔ انھیں
کل انھیں لمحات کی پرچھائیاں رہ جائیں گی
وقت کی موجیں بہا لے جائیں گی سارے گہر
ریت پر ساحل کی خالی سیپیاں رہ جائیں گی
(۶۴)

ایک اور مثال دیکھئے جس میں شاعر نے بہت سلیس انداز میں انسان کو زندگی اور موت کے سامنے بے بس ولاچار دکھایا ہے۔

نہ زندگی پہ ہے قابو، نہ موت پر قابو
بساطِ دہر میں انسان ہے کس قدر مجبور
(۶۵)

شاعرؔ نے زندگی کی بے ثباتی کا اظہار کرتے ہوئے حیات وکائنات کو ایک جھوٹے سپنے اور موت کو ایک انجانے سے خوف سے تعبیر کیا ہے جس نے جینے کا لطف زائل کر دیا ہے۔

بادل ، بجلی ، برکھا کیا ہے
سب کچھ نظروں کا دھوکا ہے
جیون ایک سندر سپنا ہے
سپنا کب سچا ہوتا ہے

انجانا سا خوف ہے طاری
سناٹا کچھ بول رہا ہے

کیوں جینے کی چاہ کریں ہم
اب جیون میں رکھا کیا ہے
(۶۶)

شاعرؔ کے نزدیک زندگی کا آج اور کل قابل اعتبار نہیں ہے۔ کیوں کہ موت برحق ہے۔ انسان کائنات کے اس نظام کے سامنے بے بس ولاچار ہے کیوں کہ موت انسان کے ساتھ ایک چلتا پھرتا ساتھی ہے جو کسی بھی صورت اس سے فرار اختیار نہیں کرسکتا۔ زندگی ان کے ہاں ایک ایسا دیپک ہے جو پل بھر میں 'گل ہوجائے گا۔

حقیقت پسندی

ہر شاعر یا ادیب اپنے عہد و ماحول سے کسی نہ کسی صورت میں مرعوب ضرور ہوتا ہے اور اس میں جنم لینے واقعات و حوادث کو گہرائی سے محسوس کرتے ہیں اور معاشرے کی کج روی پر شعر یا نثر کے لبادے میں تنقید بھی کرتے ہیں اور معاشرے میں ہر بے راہروی کے خلاف آواز بھی بلند کرتے ہیں۔ شاعرؔ نے کراچی میں سکونت اختیار کرنے کے بعد جو شاعری کی ہے اس میں فکر و فن کا خوبصورت امتزاج ملتا ہے۔ انہوں نے زندگی کے حقائق کی عکاسی بڑی خوش اسلوبی اور کھلی ہوئی آنکھوں سے کی ہے۔ انہوں نے مجاز سے حقیقت کی طرف سفر کیا ہے یہی وجہ ہے ان کے آخری دور کی شعر گوئی میں حقیقت پسندانہ رجحان زیادہ غالب نظر آتا ہے۔ ان کے ہاں تلخ حقائق کا بیان جابجا نمایاں ہے۔ جو ایک خستہ حال طبقے کی غمازی بھی کرتا ہے اور ان کی ترقی پسند فکر کی ترجمانی بھی اور ساتھ ان کی زندگی کے تجربات و مشاہدات کا مظہر بھی ہے۔ اس حوالے سے شفیق احمد شفیق یوں رقم طراز ہے:

> ''ان (شاعرؔ صدیقی) کے ہاں حقائق کو نظر انداز کرنے کا رویہ نہیں ملتا۔ وہ اپنے آس پاس اور دور دراز کے محرکات سے غافل نہیں، انہوں نے صداقت کا دامن بڑی مضبوطی سے تھام رکھا ہے۔ اس کی شاعری میں زندگی کے خوش کن لمحات کے اظہار کے ساتھ ساتھ اداس کردینے والے حادثوں اور واردتوں کی بھی پرچائیاں اپنے شعری امکانات کے ساتھ موجود ہیں'' (۶۷)

انہوں نے کبھی حالات سے سمجھوتا نہیں کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں اگر اس معاشرے میں سچائی کا ساتھ دینا اور سچ بولنا جرم ہے تو ہم اس جرم کو بار بار کریں گے۔ انہیں زندگی میں حقیقتوں کی تلاش ہے۔ جس

کا اظہار انھوں نے اپنی غزلوں میں بھی بھرپور انداز میں کیا ہے:

نہ کر سکے کبھی حالات سے جو سمجھوتا
انھی میں ہوتا ہے شاعرؔ شمار ہمارا بھی

(۶۸)

تمہارے عہد میں سچ بولنا ہے جرم مگر
یہ جرم ایسا ہے ہم بار بار کرتے ہیں

(۶۹)

شاعرؔ خود کو ایک آزاد مرد تصور کرتے ہیں۔ وہ جو کچھ دیکھتے ہیں بلا خوف و خطر بیان کرتے چلے جاتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ جرم صداقت کی سزا بھگتنے میں وہ دار و رسن پر چڑھنے سے بھی پیچھے نہیں ہٹتے۔ وہ کہتے ہیں ہم نے وہ لکھا ہے جو محسوس کیا ہے۔ سچ بولنا اگر جرم ہے تو پھر ہم اس کے سزاوار ہیں۔

جو دیکھتا ہوں وہ بولتا ہوں، نہ خوف کوئی نہ کوئی لالچ
کبھی سوچتا ہوں یاروں، عجیب آزاد مرد ہوں میں

(۷۰)

یہ جرم ہے شاعر تو سزایاب ہیں ہم لوگ
ہم نے وہی لکھا ہے جو محسوس کیا ہے

(۷۱)

سچ اگر جرم ہے تو اس کی سزا دی جائے
دور سقراط کی پھر یاد دلا دی جائے

(۷۲)

عشرت رومانی شاعرؔ صدیقی کی حقیقت پسندانہ فکر کی ترجمانی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''زندگی کی مکمل سچائی تک پہنچنے کے لیے شاعرؔ صدیقی نے نظریۂ
حیات پر مضبوط گرفت رکھی اور دروں بینی کے عمل سے گزرتے

ہے۔اُنہوں نے ذات کے سمندر میں ڈوب کر انسانی رشتوں کے حوالوں سے ساحلِ حیات پر آنے والے زمانوں کے لیے شاعری کی جو شمع روشن کی ہے وہ نئی نسل کے لیے لازوال ہونے کے علاوہ باعثِ افتخار ہے۔''(۳۷)

حق گوئی و بے باکی شاعرؔ کے کلام کا وہ خاصہ جو اُن کو ہم عصر شعرا میں ایک منفرد مقام عطا کرتا ہے۔ان کے ہاں زمین سے وابستگی، ماحول وفضا کی سنگ دلی، منافقت، انسانی استحصال، امن وآشتی اور دیگر سانحات وحادثات ایک جذباتی اظہار کے ساتھ جلوہ گر ہیں جو اُن کی حقیقت پسندانہ ذہنیت کے عکاس ہیں۔

سماجی مسائل

کسی قوم کی رہن سہن تہذیبی، معاشرتی، ثقافتی اور اقتصادی معمولات سماج یا معاشرہ کہلاتا ہے۔یہ ایک فطری امر ہے کہ تخلیق کار اپنے سماج سے کسی نہ کسی صورت جڑا ہوا ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ وہ ارد گرد ہونے والے سماجی اور معاشرتی تغیرات کو صرف نظر نہیں کرسکتا۔شعرا اور ادبا نے ہر دور میں اپنی تہذیب وثقافت اور معاشرتی وسماجی مسائل کو نثر یا شعر کے لبادے میں بیان کیا ہے۔

شاعرؔ صدیقی دوسرے شعرا کی طرح اپنے عہد سے وابستہ سماجی مسائل کو بھرپور انداز میں پیش کیا ہے۔ وہ معاشرتی مسائل سے خوب آگاہی رکھتے ہیں اور اس کو شعر کا جامہ پہنا کر بیان کرتے ہیں۔ان کی شاعری میں اس دور کی تصویر دکھائی دے رہی ہے جس میں وہ زندگی بسر کر رہے ہیں۔ پروفیسر اظہر قادری اس ضمن میں یوں لکھتے ہیں۔

''انہوں نے طبقاتی سماج میں جنم لینے والے مسائل کے کڑے تیور کو فنی شائستگی سے جس طرح رام کرنے کی کوشش کی ہے وہ ہر اعتبار سے ایک مستحسن عمل ہے۔ان کے یہاں ایسے اشعار کی کمی نہیں جو اس بات کا واضح پتہ دیتے ہیں کہ انہوں نے سماج کے جدید مسائل اور فکر کے جدید گوشوں کو اپنی تخلیقی کاوشوں کا حصہ بنانے میں اپنی فہم وفراست سے اچھی طرح کام لیا ہے''(۴۷)

شاعرؔ صدیقی نے معاشرے میں غربت وافلاس، بدامنی، بے روزگاری،نفرت وعداوت،اور انسانی استحصال جیسے مسائل کوشعر کے سانچے میں سمودیئے ہیں۔انہوں نے معاشرے میں جنم لینے والے مسائل پر نہ صرف تنقید کی ہے بلکہ ان کی اصلاح کرنے کوشش بھی کی ہے۔شاعرؔ کہتے ہیں کہ موجودہ معاشرہ اس سطح پر آچکا ہے کہ ہم عبرت کے نشان بن چکے ہیں:

ہم ہیں عبرت کے نشاں
بے زمیں، بے آسماں
ہر نفس آتش فشاں
زندگی دھواں دھواں
قصۂ جرم وفا
داستاں در داستاں (۷۵)

شاعرؔ صدیقی کا واسطہ ایک ایسے معاشرے سے ہے جہاں درندوں کا دور دورا ہے ایک انسان دوسرے انسان سے خوف محسوس کرتا ہے۔ جہاں ایمان،شرافت اور محبت کوئی معنی نہیں رکھتی۔ایک ایسا معاشرہ جہاں انسانیت ناپید ہوچکی ہے۔

درندہ سونگھتا پھرتا ہے کوئی
کوئی انسان ملے تو پھاڑ کھائے
(۷۶)

دیدنی ہے نظام دنیا کا
آدمی آدمی سے کترائے
(۷۷)

انسانیت کو ڈھونڈتے پھرتے ہیں ہم ضرور
انسانیت کا شور بہ ظاہر وطن میں ہے
(۷۸)

شاعرؔ نے وقت کے رہنماؤں پر بھی طنز کیا ہے جو ہمیشہ عوام کو دھوکہ دے کر اقتدار میں آتے ہیں

اور پھر عوام کا استحصال کرتے ہیں۔

نہ واپسی کا ہے رستہ ،نہ جادۂ منزل
یہ کس مقام پہ لے آیا راہبر اپنا
(۷۹)

تم نے منزل پہ لاکے لوٹا ہے
ایک عیار رہنما کی طرح
(۸۰)

رہبروں نے دام پھیلائے بہت
کہیے اب راہرو کدھر جائے
(۸۱)

شاعرؔ صدیقی کہتے ہیں اب اس قوم میں وہ سطح آچکی ہے جو نشیمن میں روشنی لانے کے لیے نشیمن ہی کو آگ تک لگانے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔

لگا کے آگ نشیمن میں روشنی کے لیے
ہم اس طرح سے بھی جشن بہار کرتے ہیں
(۸۲)

صبا نے آگ لگائی کلی کی آنکھ ہے نم
چمن چمن نے منایا بہار کا موسم
(۸۳)

شاعرؔ نے اپنی غزلوں میں جابجا اپنے شہر کراچی کے ناگفتہ بہ حالات کے تذکرے بھی کیے ہیں۔ جو ایک طرح ان کی عصری شعور کی غماضی بھی کرتی ہیں:

ان دنوں شہر کراچی کا ہے وہ حال کہ بس
شاخِ زیتون پہ ہو زخمی کبوتر جیسے
(۸۴)

جس شخص کو دیکھو یہاں آسیب زدہ ہے
یہ شہر ترا شہر یا کوہندا ہے
(۸۵)

شاعرؔ معاشرے میں غربت وافلاس کا گہرا احساس رکھتے جہاں لوگ رزق کی تلاش میں ساری رات جاگتے رہتے ہیں۔ جہاں انسان مشین کی مانند کام میں مگن رہتا ہے اور معاش سے زیادہ مکان کی فکر کرتے ہیں۔

کتنا عجیب شہر ہے، کتنے عجیب لوگ
راتوں کو جاگتے ہیں یہاں خوش نصیب لوگ
فکر معاش تو نہیں فکر مکان ہے
اس شہر میں ہیں ایسے بھی کچھ بدنصیب لوگ
(۸۶)

بعض موقعوں پر ایسا بھی لگتا ہے کہ شاعرؔ معاشرتی حالات سے دل برداشتہ ہوگیا ہے۔ اور وہ اس دنیا سے اپنی فکری ہم آہنگی سمیٹ کر اپنے تخیل میں عالم بالا کی طرف کوچ کرنے کے خواہاں ہیں:

سکون ہے نہ تحفظ ہے اور نہ آزادی
ہمارا گھر بھی عجب گھر ہے کیا کیا جائے
(۸۷)

اب یہ دنیا تو جہنم سے بھی بدتر ٹھہری
چاند تاروں میں بسالیں چلو دنیا کوئی
(۸۸)

شاعرؔ صدیقی نے سماج میں اُبھرنے والے مسائل اپنے عصری شعور کی روشنی میں بیان کیے ہیں۔ انہوں نے معاشرے میں جو کچھ دیکھا اور محسوس اور جس سے متاثر ہوا اس کو ایک سادہ وسلیس روش میں ذکر کیا ہے۔ امیر حسین چمن لکھتے ہیں:

''شاعرؔ صدیقی اسی دور کے مبتدی شاعر ہونے کے باوجود ہمیں اپنی

شاعری میں ایک نئے لب و لہجے کے ساتھ ہمارے عہد کے سنگین طبقاتی
مسائل اور فکری رجحانات کی ترجمانی کرتے دکھائی دیتے ہیں اور یہی
خصوصیات اس دور کے مایہ ناز غزل گو شعرا کے حوالے سے آہنگ نو کے
ساتھ ان غزلوں میں بھرپور طریقے سے نمایاں ہے'' (۹۸)

ان کے ہاں ایک ایسے خستہ حال معاشرے کی تصویر دیکھی جاسکتی ہے جہاں کسی کو اپنے سود وزیاں کا احساس تک نہیں ہوتا جہاں کا ہر فرد ایک پتھر کی مانند ہے۔ جہاں محبت ترازو میں تولی جاتی ہے جہاں ظالم اور غدارانِ وطن کو معزز سمجھا جاتا ہے اور حق گوئی اور سچائی جرم تصور کی جاتی ہے۔

احساس تنہائی

شاعرؔ صدیقی کی غزل متنوع موضوعات کی حامل ہے لیکن ان کے ہاں ہجرت اور سقوط ڈھاکا کے بعد جس جذبے کا زیادہ غلبہ رہا ہے وہ ان کی احساس تنہائی ہے۔ شاعرؔ صدیقی کی غزلوں میں ہمیں وہ انسان ملتا ہے جو مسلسل ہجر اور ہجرتوں کے دکھ سہہ کر تھک چکا ہے اور وہ اپنے دل کا درد لیے ہوئے ایک ایسے ہم سفر کی تلاش میں ہے جو اس کے دکھ درد اور تنہائی کو مٹا سکے۔ لیکن اسے ایسا فرد معاشرے میں کہیں نظر نہیں آتا۔ وہ حوادث زمانہ سے اسی طرح دل برداشتہ ہو چکا ہے کہ بعض اوقات ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کو ختم کرنے پر آمادہ ہو گیا ہے۔ اس کا دل موجودہ سماج کے انسان سے متنفر ہو گیا ہے اور وہ تنہا جینا چاہتا ہے۔

شاعرؔ تن تنہا مقابلِ خارزارِ حیات ہے۔ وہ سماج سے سائباں کے لیے ترس رہا ہے۔ ہر طرف نفرت کی صدائیں ہیں۔ اس نفرت کی آندھی میں وہ اپنے آپ کو تنہا فرد سمجھ رہے ہیں اور پیار و محبت کے سرگم چھیڑنے میں مگن ہے۔ شاعرؔ نے اپنے عہد کے محبوب سے بھی شکوہ کی ہے جس نے ان کو اکیلا چھوڑ دیا ہے اور اس میں وفا کی بوتک نہیں ہے۔ شاعر حوادث زمانہ سے بھی دل برداشتہ ہو چکا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے جس نے شاعرؔ کو اکیلے پن کا احساس دلایا ہے:

یہ دل تنہا مقابل خار زارِ حیات ہے
گھرا ہوا ہے جو کانٹوں میں وہ گلاب ہوں میں
(۹۰)

اکیلے پن کا یہ احساس کیوں نہیں جاتا
یقین کیوں نہیں آتا کہ ہم سفر تم ہو
(۹۱)

اس حسین وادی میں نفرتوں کی آندھی میں
جل رہے ہیں ہم شاعر پیار کا دیا بن کر
(۹۲)

شاعرؔ صدیقی اس دنیا میں خود کو تنہا محسوس کرتے ہیں۔انہیں کوئی ہم درد اور مسیحا نہیں ملتا جس کو وہ اپنے دل کا حالت زار بیان کر سکے۔وہ اس دنیا سے اکتا گئے ہیں۔انہیں یہاں جس آسودگی کی تلاش ہے وہ روپوش ہے جو ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتی۔اس لیے ان کا اعتبار اٹھ گیا ہے۔اس حوالے سے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

میں اپنا حال دل کس کو سناؤں
بھری دنیا میں تنہا بہت ہوں
(۹۳)

انگنت پرچھائیاں اور مری تنہائیاں
پھر چمن مہکا مرا زخم جگر تازہ ہوا
(۹۴)

شاعرؔ کی تنہائی میں فراق محبوب نے بھی اضافہ کیا ہے۔وہ محبوب سے شکوہ تو کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود ان کی شب تنہائی محبوب کی یاد سے خالی نہیں ہیکیوں کہ محبوب کی یاد اُن کے دل میں اسی طرح آتی ہے جس طرح شام کو کوئی پرندہ اپنے نشیمن میں لوٹ آتا ہے۔جب انہیں وصال محبوب میسر ہوتا ہے تو کائنات کی ہر چیز حسین لگتی ہے۔اس عالم میں وہ تنہائی سے ڈر محسوس کرنے لگتے ہیں۔

شب تنہائی میں آتی ہے تیری یاد بہت
پلٹ آتا ہے جیسے شام کو طائر نشیمن میں
(۹۵)

مجھے یہ ڈر ہے کہ اب ٹوٹ ہی نہ جائے کہیں
وہ ایک درد کا رشتہ جو درمیان میں ہے

(۹۶)

مری تنہائیوں میں بھی اکثر
ساتھ رہتی ہیں رات بھر آنکھیں

(۹۷)

تنہائی کا احساس شاعرؔ صدیقی کے تخلیقی سفر میں معاون ثابت دکھائی دیتا ہے۔ وہ ناصر کاظمی کی طرح اپنے تنہائی پر نازاں معلوم ہوتے ہیں۔ شاعرؔ کا حال ان کے سنہرے ماضی کی داستان سناتا ہے اور ان کی تنہائی کا نوحہ نغمۂ محفل بن جاتا ہے:

اپنی بربادی میں بھی ہے ایک آبادی کی شان
میری تنہائی کا نوحہ، نغمۂ محفل ہوا

(۹۸)

مارے گئے ہیں زیست کی تاریک راہ میں
وہ لوگ اب کہاں ہے جنہیں ہم نواکریں

(۹۹)

شاعرؔ اپنی ابتدائی زندگی میں بہت خوش معلوم ہوتے ہیں جس کو انہوں نے سونے سے تعبیر کیا ہے۔ وہ جب ماضی کو یاد کرتے ہیں تو ان کی احساس تنہائی شدت اختیار کرتی ہے۔ انہیں اپنی ماں سے محرومی کا بہت گہرا احساس ہے جس سے انہوں نے اپنی والہانہ محبت کا اظہار کیا ہے لیکن وہ ماں سے شکوہ بھی کرتے ہیں۔ کہ اس نے بھی شاعر کو پیاسا چھوڑ دیا:

سوچو! ہم نے ایک معما چھوڑ دیا
مٹی کے بدلے میں سونا چھوڑ دیا

مانا اس کی ذات سمندر جیسی تھی
اُس نے بھی شاعرؔ کو پیاسا چھوڑ دیا
(۱۰۰)

شاعرؔ صدیقی اپنی زندگی میں جن واقعات وحوادث سے گزرے وہ ان کے احساس تنہائی کے محرک بنے۔اُنہوں نے ساری زندگی ہجرت میں قدم جمائے رکھا۔ ڈھاکا چھوڑ کر کراچی ہجرت کی۔ مشرقی پاکستان کی غارت گری کی وجہ ان کے دل ودماغ میں تنہائی ،دردغم،خوف اور افراتفری جیسے حزنیہ عناصر نے جنم لیا دوست واحباب بچھڑ گئے۔وطن کو چھوڑنا پڑا جس میں شاعرؔ صدیقی خود کو تن تنہا محسوس کرنے لگا۔وہ زندگی کے ہر موڑ پر محرومیوں کے شکار رہے ہیں۔ان کے کلام میں نغمگی اور غنائیت نے اس احساس کو مزید جلا بخشی ہے۔وہ رات کی تاریکیوں میں تنہائی زہر سمجھتے ہیں۔جب وہ اکیلا ہوتا ہے تو ایک سایے کی طرح تنہائی ساتھ ہوتی ہے۔جس کے باعث ان کی اداسی اور بڑھ جاتی ہے۔علاوہ ازایں زمانے کے ناگفتہ بہ واقعات وحوادث نے بھی ان کے کلام میں تنہائی کے گہرے احساس کو جنم دیا ہے۔

روایت پسندی

شاعرؔ صدیقی کا کلام جدیدیت اور کلاسیکیت کا سنگم ہے۔انہوں نے جہاں شاعری میں عصری تقاضوں کا خیال رکھا ہے وہاں روایتی روش سے بھی بھرپور استفادہ کیا ہے۔اس معاملے میں وہ اندھی تقلید کے قائل نہیں بلکہ انہوں نے اپنے جذبات اور احساسات کے بنا پر اپنے دور کے معاشرتی مسائل،واقعات وحوادث اور دیگر سماجی تقاضوں کا بھی پورا خیال رکھا ہے۔ایک طرف اگر شاعر نے کلام کو تازگی اور نیا پن بخشا تو دوسری جانب انہوں نے کلاسیکی روایت سے بھی بھرپور فائدہ اُٹھایا ہے۔اس حوالے سے اکرم کنجاہی یوں رقمطراز ہیں:

> ''شاعرؔ صدیقی نے ابتدائے شعر گوئی میں کلاسیکی روایت سے استفادہ کیا۔طویل مترنم بحور،جذبات محبت کے سوز گداز سے مملو مضامین جیسے ہجر فراق کی شام ہے،عاشق کعبہ بھی چھوڑ بیٹھا ہے اور بت خانہ بھی،دنیا سے آنکھ چرا کر شاعر غرقِ صہبا ہے،عشق بے تاب ہے کہ میرا غم آشکارا ہونے سے کہیں رسوا نہ ہو جائے''(۱۰۱)

اس روایتی انداز فکر اور جدید لب ولہجہ کو ساتھ لیے ہوئے شاعرؔ نے پُر جوش انداز میں اپنے داخلی واردات وجذبات کو بھرپور طریقے سے بیان کیے ہیں۔انہوں نے جہاں سراپائے محبوب کے تذکرے کیے ہیں تو وہاں اُن کا انداز فکر روایت سے بالکل ہم آہنگ نظر آتی ہے۔ادب کے طالب علم ہونے کی حیثیت سے اُنھوں نے اُردو کے کلاسیکی شعری ادب کا خاصا مطالعہ کیا تھا۔اس وجہ سے انہوں نے یہ اثرات براہ راست قبول کیے ہیں۔شاعرؔ صدیقی کی غزلوں میں شراب،ساقی، مے خانہ،دیر وحرم،مسجد ومندر،لب ورخسار،گیسو جانان،خم وکاکل،ڈوبتی ناؤ، یورش طوفاں اور گردش دوراں جیسے روایتی استعارات وعلامتیں ملتی ہیں۔کلیم رحمانی لکھتے ہیں:

''شاعرؔ صدیقی نے اپنے اشعار میں کسک کو ایک نمایاں جگہ دی اور رویتی انداز فکر کو بھی اپنایا ہے لیکن اُن کی شاعر میں جدید لب لہجہ کا فقدان نہیں''(۱۰۲)

شاعرؔ صدیقی کی غزلوں میں ان کی روایتی طرز فکر کی اُٹھان دیکھی جاسکتی ہے۔روایت اور جدت کے مخلوط اثرات ان کی غزلیات پر نمایاں ہیں۔محبوب کی رخصتی کا لمحہ شاعر کے لیے کسی قیامت سے کم نہیں ہوتی۔انہیں محبوب کا غم بھی عزیز ہے جس کی رسوائی وہ گوارا نہیں کر سکتے:

پکارتے ہی رہے ساغر و صبوح لیکن
مجھے قبول نہ تھی تیرے غم کی رسوائی
(۱۰۴)

یاد ہے اب تک وقتِ سفر اُف وہ قیامت کا منظر
زلف پریشاں،پھیلا پھیلا کاجل اور لرزتے ہونٹ
(۱۰۵)

تیری کیا نگاہ بدل گئی نہ وصبح ہے، نہ وہ شام ہے
یہی زندگی کی تھی جام مے،یہی آج زہرِ جام ہے
(۱۰۶)

شاعرؔ صدیقی کے کلام سے ملاحظہ کیجئے جن میں وہ کلاسیکی اور روایتی طرز کے حامل دکھائی دیتے ہیں:

میری عرض محبت پہ جو دفعتاً سر سے آنچل کسی کا ڈھلکنے لگا
پھول کھلنے لگے، چاند ہنسے لگا، سارا گلشن کا گلشن مہکنے لگا
ایک سیمیں بدن بنت ماہتاب سے، یک بیک جو کبھی سامنا ہوگیا
ساز بجنے لگے، گیت ڈھلنے لگے، آنکھ جھکنے لگی، دل دھڑکنے لگا
اُف وہ گلنار لب ریشمی ریشمی اُف وہ چشمِ حسیں مے چکاں مے چکاں
پھر مجھے یاد آنے لگا وہ سماں پھر سے تصور میں ساغر چھلکنے لگا
(۱۰۷)

شاعرؔ نے طویل بحور کا استعمال بھی کیا ہے۔ جو نغمگی اور ترنم کے ساتھ ساتھ روایتی مضامین، استعارات اور کنایات سے بھی معمور ہیں۔ اس حوالے سے چند مثالیں ملاحظہ ہو:

تم کو آنا تھا اور تم نہ آئے مگر آرزو دل کی دل میں مچلتی رہی
چاند اپنا سفر ختم کرتا رہا، شمع جلتی رہی، رات ڈھلتی رہی
عشق میں ہے وہی سوز درد و اثر، حسن میں ہے وہی نغمہ و کیف و رنگ
ہم بدلتے رہے، تم بدلتے رہے، یہ نہ سمجھو کہ دنیا بدلتی رہی
(۱۰۸)

یہ گرم آنسو، یہ سرد آہیں، یہ سوز غم، مضمحل تبسم
یہی تو ہے حاصل محبت انھی کو دل سے لگا رہا ہوں
وہ جام آنکھوں کا چھلکا چھلکا، لبوں کا وہ شبنمی تبسم
تصوروں کی حسین شمعیں جلا رہا ہوں، بجھا رہا ہوں
(۱۰۹)

شاعرؔ صدیقی نے اگرچہ اپنی غزلوں میں کافی حد تک روایت کی پاسداری کی ہے تو دوسری طرف وہ شعور آگہی کے بنا پر حالات کی نشیب و فراز اور دیگر عصری تلازمات سے بچ نہیں نکلا ہے۔ عارف منصور اس ضمن میں تحریر کرتے ہیں:

''رچے رچائے لہجے میں شاعرؔ کی غزل اسے بلند مراتب سے آشنائی دیتی نظر آتی ہے کیوں کہ ان کے اشعار میں روایت سے فیض یابی کے ساتھ ساتھ اپنے عہد کے تلازمات بھی نمایاں جگہ پانے میں کامیاب رہے ہیں۔''(۱۱۰)

ان کا طرز نگارش، ہیئت اور دیگر فکری وفنی عناصر کے اعتبار سے روایتی ہے۔اُنہوں نے جہاں فنی پختگی کا مظاہرہ کیا ہے وہاں روایت سے بھی بھرپور مستفید ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔اسی طرح اُن کی شاعری میں قدیم اور جدید کا ایک خوبصورت اور خوشگوار امتزاج ملتا ہے۔شاعرؔ صدیقی شعروادب کے مزاج اور مختلف رجحانات سے خوب واقفیت رکھتے ہیں۔انہوں نے روایتی ڈگر پر چل کر ان مختلف رجحانات کو اپنا کر اُردو شاعری کا دامن مالا مال کر دیا ہے۔

خارجیت

شاعری زندگی اور زندگی میں رونما ہونے والے حالات و واقعات کی عکاس ہوتی ہے۔وہ شاعری زیادہ عرصے تک زندہ نہیں رہ سکتی جس پر شاعر کے داخلی جذبات غالب ہوں۔شاعر یا ادیب فکرو تخیل جب اپنی ذات کے خول سے باہر نکل کر دنیا کے نشیب وفراز اور حسن وقبح میں صرف ہو جاتا ہے تو بقائے دوام سے متصف ہو جاتا ہے۔

شاعرؔ صدیقی کا کلام خارجی مظاہر سے معمور ہے۔ابتدائی شعر گوئی کے نسبت ان کی موجودہ دور کی شاعری میں داخلی عناصر کم اور خارجی تجربات اور مشاہدات زیادہ غالب ہیں۔یہ اظہار ان کے ہاں ایک منفرد پیرائے میں ملتا ہے۔ایک طرف اگر وہ دکھ درد کا احساس رکھتے ہیں تو دوسری طرف وہ دنیا کے حسن سے بھی شناسا ہیں۔ان کی شاعری سورج، چاند ستاروں، سمندروں، جنگلوں، ڈھلتی راتوں، ڈوبتا ہوا سفینہ، جھرنے، صحرا ہی صحرا اور اجڑی ہوئی بستی کی شاعری ہے۔امیر حسین چمنؔ تحریر کرتے ہیں:

''شاعرؔ صدیقی کا کلام دیکھ کر ایسا لگتا ہے جیسے شاعر نے دھڑکن کی انہی مدھم اور تیز آرزوؤں کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر شاعری کی تمام تر خصوصیات سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔دل پر چھوٹ لگنے کی آواز ہو یا حسین کلیوں

کے چٹکے کی صدا، سرسبز وشاداب مترنم وادیوں کے دلکش نظارے ہوں یادرختوں کے جھنڈ میں چہچہاتے پرندوں کی کانوں میں رس گھولنے والی حیات آفریں آوازیں شاعر نے زندگی کے ہر گوشے اور اپنی دنیا کی ہر آواز کو اسی بصارت وسماعت سے دیکھا اور سنا ہے جو قدرت نے انسان کو وہ شے دیکھنے اور سننے کے لیے عطا کی ہے۔ رنج والم سے ہٹ کر جہاں شاعر صدیقی نے قدرت کے حسین نظاروں یا انسان کی طربیہ کیفیت کی بات کی ہے وہاں ان کی قوت مشاہدہ اپنی تمام تر جولانیوں کے ساتھ کہکشاں کی مانند قرطاس فکر پر اُتر آئی ہے۔'' (۱۱۱)

شاعرؔ صدیقی کا کلام عصر حاضر کا آئینہ ہے ان کی غزلوں میں محض اپنے احساسات وجذبات نہیں بلکہ ملکِ پاکستان اور خاص کر شہر کراچی میں کشت وخوں کی گرمی، تڑپتی لاشیں، بارود کی گھن گرج اور بم دھماکوں کی خوفناک گونج بھی سنائی دیتی ہے۔ سیاستدانوں کے ہاتھوں عوام کا استحصال اور ان کی مفاد پرستیاں، غربت فکر معاش جیسے عوامل کا اظہار بھی ملتا ہے۔ انہوں نے سارے اشک غم دوراں کے لیے بہائے ہر درد کو اپنے پہلو میں سمیٹا اور دوسروں کے غم کو دیکھ کر ان کی آنکھیں بھر آتی ہیں۔ وہ حصار ذات سے نکل کر حالاتِ انسان کی بات کرتے ہیں۔ جس میں ہر شخص کا چہرۂ ورق مصور دکھائی دے رہا ہے۔ ہر فرد خوف اور آسیب کا شکار ہے۔ لوگوں نے خود کو گھر کی چار دیواریوں میں مقید کرلیا ہے۔ ایسے حالات جس میں قاتل اور مسیحا کا امتیاز ناممکن ہو چکا ہے۔ جہاں کی فضا بارود کی بو سے بوجھل ہوگئی ہے۔ ان حالات وواقعات کی عکاسی شاعرؔ صدیقی کچھ یوں کرتے ہیں:

آج بارود کی بو سے ہیں فضائیں بوجھل
کیسے بیٹھے گا سرِ شاخ پرندہ کوئی
(۱۱۲)

بارود کے اک ڈھیر پر بیٹھے ہوئے تھے لوگ
میں امن و آشتی کی فضا ڈھونڈتا رہا
(۱۱۳)

علاوہ ازیں شاعر کے کلام میں فطری عناصر کا اظہار بھی شگفتہ انداز میں جلوہ گر ہے۔

دھرتی اپنی ماں ہوتی ہے، ماں سے کس کو پیار نہیں
اس کی زمیں کا ذرّہ ذرّہ آنکھ کا تارا لگتا ہے
شام کی لالی یوں لگتی ہے جیسے سہاگن کا جوڑا
بھور سمے چڑیوں کا چہکنا گیت سہانا لگتا ہے
یہ صحرا، یہ مست سمندر، یہ پربت، جھرنے، دریا
غور کرو شاعرؔ تو سب کچھ ایک تماشا لگتا ہے
(۱۱۴)

شاعرؔ نے خارجی منظر نامے کو گہرے احساس کے ساتھ دیکھا اور بیان کیا ہے۔ یہ منظر نامہ ان کے ہاں پھیلا ہوا ہے۔ ذات کے علاوہ انہوں نے زندگی کے ہر پہلو کا اجاگر کیا ہے۔ ان کی خارجیت فطری ہے۔ جس کی اصل وجہ شاعر پر گزرے ہوئے ناگفتہ بہ حالات ہیں۔ شاعر نے سقوط ڈھاکہ کی غارت گری بھی دیکھی اور ہجرت کے بعد شہر کراچی کی صورت حال بھی دیکھا جس کا سوچنا بھی انسان گورا نہیں کرسکتا ہے۔ لیکن پھر بھی وہ زندگی میں پراُمید نظر آتے ہیں۔

محبت اور حسن پرستی کا جذبہ شاعر؟ صدیقی کی روح میں بسا ہوا ہے۔ ان کی شاعری میں بھیگی پلکیں، چنچل آنکھیں، پیالے اور پیمانے ہونٹ جیسے الفاظ کی کمی نہیں جس کے ذریعے انہوں نے محبوب کے نقوش اجاگر کیے ہیں اور یہ الفاظ وتراکیب ان کے خارجی رجحان کی ترجمانی کرتے ہیں۔

پاکستان میں اُردو غزل کے ساتھ بہت سے شعرا کے نام منسوب ہیں۔ ہر ایک نے اپنی ایک الگ پہچان بنائی ہے۔ اس حوالے سے شاعرؔ صدیقی کا گوشہ نشینی میں یا پس منظر میں چلے جانے کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ غزل کہنے کے معاملے میں اپنے ہم عصر یا دیگر شعرا سے کم نظر آتے ہیں بلکہ اُن کی غزل میں ایک پختہ کار شاعر کے ایسے آثار جلوہ گر ہیں جو اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ شاعرؔ صدیقی غزل کا ایک کامیاب شاعر ہے۔ اُن کی غزلوں کی عظمت اس بات میں ہے کہ یہ صرف اُن کے داخلی واردات کے اظہار تک محدود نہیں ہیں بلکہ اپنے عہد کے سیاسی، سماجی، معاشی اور معاشرتی موضوعات سے معمور

ہیں۔ان میں درد وغم کے علاوہ انسان دوستی،حق گوئی،انقلابی فکر،دنیا کی مکر وفریب اور دیگر سماجی مسائل کے تذکروں نے اُن کی غزل کو ہمیشہ کے لیے زندہ وجاید کر دیا ہے۔

دیگر اصناف کے برعکس غزل میں اُن کی شخصیت کل کر سامنے آتی ہے۔کیوں کہ شاعری اور شخصیت کا آپس میں جو رشتہ ہوتا ہے وہ اُن کا غزل کے ساتھ زیادہ مستحکم معلوم ہوتا ہے۔جہاں تک میں سمجھتا ہوں شاعرؔ نے اپنے جذبات کے اظہار کے لیے صنفِ غزل کا انتخاب کیا تھا جو اُن کا سب سے پسندیدہ صنف ہے۔اُردو غزل سے اُن کی رحانی وابستگی ہے شاید یہی وجہ ہے کہ اُن کی شاعری کا بیشتر حصہ غزل پر مشتمل ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

حوالہ جات

۱۔محمد عبدلحفیظ قتیلؔ، ڈاکٹر، معیار غزل، اعجاز پرنٹنگ پریس چھتہ بازار حیدرآباد دکن، ۱۹۶۱ء ص ۹

۲۔سعد کلیم اللہ، ڈاکٹر، اُردو غزل کی تہذیبی و فکری بنیادیں، گنج شکر پریس، لاہور، ۲۰۱۵ء ص ۱۳۱

۳۔سلیم اختر، ڈاکٹر، اُردو ادب کی مختصر ترین تاریخ طبع سوم، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۱۳ء ص ۶۷۱

۴۔شاعرؔ صدیقی، بجھتے سورج نے کہا، رنگ ادب پبلی کیشنز کراچی پاکستان، ۲۰۰۹ء ص ۳

۵۔انور جمال پروفیسر، ادبی اصطلاحات، طبع سوم، نشنل بک فاونڈیشن اسلام آباد، ۲۰۱۳ء، ص ۱۲۱

۶۔امیر حسین چمنؔ، ''عبدالرازق سے شاعر صدیقی تک''، رنگ ادب، سہ ماہی، شاعرؔ صدیقی نمبر، رنگ ادب پبلی کیشنز کراچی، ۲۰۰۶ء، ص ۴۳

۷۔شاعرؔ صدیقی، کلیات شاعرؔ صدیقی، رنگ ادب پبلی کیشنز، کراچی، ۲۰۱۹ء ص ۴۷۱

۸۔ایضاً، ص ۱۷۵ ۹۔ایضاً، ص ۲۴۶

۱۰۔ایضاً، ص ۱۸۳ ۱۱۔ایضاً، ص ۲۴۰

۱۲۔ایضاً، ص ۱۱۷

۱۳۔محمود اختر خان، عرض مرتب، مشمولہ، کلیات شاعرؔ صدیقی، رنگ ادب پبلی کیشنز، کراچی، ۲۰۱۹ء ص ۹۵

۱۴۔شاعرؔ صدیقی، کلیات شاعرؔ صدیقی، رنگ ادب پبلی کیشنز، کراچی، ۲۰۱۹ ص ۱۶۴

۱۵۔ایضاً، ص ۲۵۷ ۱۶۔ایضاً، ص ۲۵۷

۱۷۔ایضاً، ص ۳۸۳ ۱۸۔ایضاً، ص ۳۸۳

۱۹۔حنیف فوقؔ، ڈاکٹر، آنکھوں میں سمندر ایک جائزہ، رنگ ادب سہ، ماہی شاعرؔ صدیقی نمبر جولائی تا ستمبر ۲۰۰۶ ص ۲۵

۲۰۔شاعرؔ صدیقی، کلیات شاعرؔ صدیقی، رنگ ادب پبلی کیشنز، کراچی، ۲۰۱۹ء ص ۱۸۳

۲۱۔ایضاً، ص ۱۵۶ ۲۲۔ایضاً، ص ۱۸۱

۲۳۔ایضاً، ص ۲۲۵ ۲۴۔ایضاً، ص ۳۷۳

۵۲۔ایضاً،ص۱۳۶

۲۶۔انور جمال، پروفیسر،ادبی اصطلاحات،نشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد،۲۰۱۲ص۱۰۴

۲۷۔اکرم کنجاہی،مقدمہ،مشمولہ،کلیات شاعرؔ صدیقی،رنگ ادب پبلی کیشنز،کراچی ۲۰۱۹ص۳۰

۲۸۔شاعرؔ صدیقی،کلیات شاعرؔ صدیقی،رنگ ادب پبلی کیشنز،کراچی،۲۰۱۹ص۱۹۵

۲۹۔ایضاً،ص۱۳۷ ۳۰۔ ایضاً،ص۱۹۳

۳۱۔ایضاً،ص۱۹۳

۳۲۔شبیر،ناقدؔ،نقدفن،رنگ ادب پبلی کیشنز،کراچی،س،ن،ص۲۰۲

۳۳۔اکرم کنجاہی،مقدمہ،مشمولہ،کلیات شاعرؔ صدیقی،رنگ ادب پبلی کیشنز،کراچی ۲۰۱۹ص۴۳

۴۳۔شاعرؔ صدیقی،کلیات شاعرؔ صدیقی،رنگ ادب پبلی کیشنز،کراچی،۲۰۱۹ءص۲۶۰

۳۵۔ایضاً،ص۱۷۵ ۳۶۔ایضاً،ص۱۰۵

۳۷۔ایضاً،ص۹۹ ۳۸۔ایضاً،ص۱۵۸

۳۹۔ایضاً،ص۱۲۹ ۴۰۔ایضاً،ص۲۹۹

۴۱۔ہارون الرشید،پروفیسر،آنکھوں میں سمندر،ایک تجزیہ،رنگ ادب،شاعرؔ صدیقی نمبر جولائی تا ستمبر ۲۰۰۶ص۶۶

۴۲۔عشرت،رومانی،آنکھوں میں سمندر کا شاعر،،رنگ ادب،شاعرؔ صدیقی نمبر جولائی تا ستمبر۲۰۰۶ء۵۰۲

۴۳۔شاعرؔ صدیقی،کلیات شاعرؔ صدیقی،رنگ ادب پبلی کیشنز،کراچی،۲۰۱۹ءص۱۵۱

۴۴۔ایضاً،ص۱۲۹ ۴۵۔ایضاً،ص۱۶۴

۴۶۔ایضاً،ص۳۵۸ ۴۷۔ایضاً،ص۱۰۶

۴۸۔ایضاً،ص۷۹ ۴۹۔ایضاً،ص۳۳۱

۵۰۔ایضاً،ص۳۳۰ ۵۱۔ایضاً،ص۱۴۷

۵۲۔اکرم کنجاہی،مقدمہ،مشمولہ،کلیات شاعرؔ صدیقی،رنگ ادب پبلی کیشنز،کراچی ۲۰۱۹ءص۴۱

۵۳۔شاعرؔ صدیقی،کلیات شاعرؔ صدیقی،رنگ ادب پبلی کیشنز،کراچی،۲۰۱۹ءص۲۹۵

۵۴۔ایضاً،ص۹۹ ۵۵۔ایضاً،ص۱۷۹

۵۶۔ایضاً،ص۱۳۴ ۵۷۔ایضاً،ص۱۲۵

۵۸۔ایضاً،ص۱۲۸ ۵۹۔ایضاً،ص۱۰۲

۶۰۔ایضاً،ص۱۰۰ ۶۱۔ایضاً،ص۱۷۴

۶۲۔ایضاً،ص۱۷۴ ۶۳۔ایضاً،ص۱۰۲

۶۴۔ایضاً،ص۲۷۱ ۶۵۔ایضاً،ص۳۱۶

۶۶۔ایضاً،ص۱۰۸

۶۷۔شفیق احمد شفیق،آنکھوں میں سمندر کا تجزیاتی مطالعہ،رنگ ادب،شاعرؔ صدیقی نمبر جولائی تا ستمبر ۲۰۰۶ ص۲۳۰

۶۸۔ایضاً،ص۱۷۸ ۶۹۔ایضاً،ص۱۳۵

۷۰۔ایضاً،ص۱۶۰ ۷۱۔ایضاً،ص۱۶۲

۷۲۔ایضاً،ص۲۴۲

۷۳۔عشرت،رومانی،آنکھوں میں سمندر کا شاعر،رنگ ادب،شاعرؔ صدیقی نمبر جولائی تا ستمبر ۲۰۰۶ء،ص۲۰۵

۷۴۔اظہر قادری ،پروفیسر،قدیم وجدید کا حسین امتزاج،رنگ ادب،شاعرؔ صدیقی نمبر جولائی تا ستمبر ۲۰۰۶ء ص۶۵

۷۵۔شاعرؔ صدیقی،کلیات شاعرؔ صدیقی،رنگ ادب پبلی کیشنز،کراچی،۲۰۱۹ء ص۱۱۲

۷۶۔ایضاً،ص۱۲۰ ۷۷۔ایضاً،ص۳۶۱

۷۸۔ایضاً،ص۳۵۷ ۷۹۔ایضاً،ص۱۶۴

۸۰۔ایضاً،ص۰۸۱ ۸۱۔ایضاً،ص۱۶۳

۸۲۔ایضاً،ص۱۵۳ ۸۳۔ایضاً،ص۳۷۳

۸۴۔ایضاً،ص۱۳۷ ۸۵۔ایضاً،ص۱۶۱

۸۶۔ایضاً،ص۱۲۳ ۸۷۔ایضاً،ص۱۴۵

۸۸۔ایضاً،ص۱۱۵

۸۹۔امیر حسین چمن،عبدلرازق سے شاعرؔ صدیقی تک،رنگ ادب،شاعرؔ صدیقی نمبر جولائی تا ستمبر ۲۰۰۶، ص۳۳

۹۰۔شاعرؔ صدیقی،کلیات شاعرؔ صدیقی،رنگ ادب پبلی کیشنز،کراچی،۲۰۱۹ص۹۱

۹۱۔ایضاً،ص۱۰۳ ۹۲۔ایضاً،ص۱۸۱

۹۳۔ایضاً،ص۱۱۰ ۹۴۔ایضاً،ص۱۵۵

۹۵۔ایضاً،ص۱۰۰ ۹۶۔ایضاً،ص۱۴۱

۹۷۔ایضاً،ص۱۹۸ ۹۸۔ایضاً،ص۲۰۲

۹۹۔ایضاً،ص۱۹۲ ۱۰۰۔ایضاً،ص۱۶۶

۱۰۱۔اکرم کنجاہی،مقدمہ،مشمولہ،کلیات شاعرؔ صدیقی،رنگ ادب پبلی کیشنز کراچی ۲۰۱۹ء،ص۱۹

۱۰۲۔کلیم رحمانی،دھوپ چاؤ کا سچا شاعر،رنگ ادب،شاعرؔ صدیقی نمبر جولائی تا ستمبر ۲۰۰۶ء،ص۳۹

۱۰۳۔شاعرؔ صدیقی،کلیات شاعرؔ صدیقی،رنگ ادب پبلی کیشنز،کراچی،۲۰۱۹ء،ص۱۲۰

۱۰۴۔ایضاً،ص۲۶۳ ۱۰۵۔ایضاً،ص۲۰۸

۱۰۶۔ایضاً،ص۲۰۹ ۱۰۷۔ایضاً،ص۲۲۰

۱۰۸۔ایضاً،ص۱۹۳ ۱۰۹۔ایضاً،ص۳۳۳

۱۱۰۔عارف منصور،جگر لخت لخت،شاعرؔ صدیقی،رنگ ادب پبلی کیشنز،کراچی۲۰۱۲ء

۱۱۲۔امیر حسین چمن،عبدلرازق سے شاعرؔ صدیقی تک،رنگ ادب،شاعرؔ صدیقی نمبر جولائی تا ستمبر ۲۰۰۶ ،ص۳۵

۱۱۳۔شاعرؔ صدیقی،کلیات شاعرؔ صدیقی،رنگ ادب پبلی کیشنز،کراچی،۲۰۱۹ء،ص۱۱۵

۱۱۴۔ایضاً،ص۱۱۹ ۱۱۵۔ایضاً،ص۲۶۷

☆☆☆☆☆☆☆

شاعرؔ صدیقی کی نظم گوئی

نظم دراصل نثر کی متضاد ہے یعنی وہ کلام جس میں وزن، بحر، ترنم اور نغمگی کا خیال رکھا جائے نظم کہلاتا ہے۔لغوی اعتبار سے نظم پرونا، ترتیب دینا وغیرہ کے معنوں میں آتا ہے اصطلاح میں نظم شاعری کی وہ صنف سخن ہے جس میں فکر وخیال کے لحاظ سے تمام اشعار کسی ایک موضوع اور ایک خیال کے تحت فکری گہرائی اور شدید جذبے کے ساتھ لکھے جاتے ہیں نظم کے تمام مصرعے باہم مربوط ہوتے ہیں۔

اُردو شعری اصناف میں غزل کے بعد نظم کی اہمیت مسلمہ ہے۔اُردو میں نظم گوئی کی ابتدا قلی قطب شاہ کے زمانے سے ہوئی ہے۔قطب شاہی کے دور میں جن شعرا نے نظمیں کہی ہیں اُن میں جانؔم، ابن نشاطیؔ، ملا وجہیؔ، رستمیؔ، غواصیؔ، نصرتیؔ، ہاشمیؔ اور عبدلؔ جیسے اکابر شعرا کے نام قابل ذکر ہیں۔بعد میں یعنی اٹھارویں صدی کی چوتھی دہائی میں نظم کے اس ارتقائی سفر میں نظیر اکبر آبادی نے سب سے اہم رول ادا کیا ہے۔نظیرؔ نے نظم کو ایک عوامی صنف سخن کی حیثیت سے متعارف کرایا اور پہلی مرتبہ محاسن مناظر فطرت کے علاوہ دیگر عوامی سرگرمیوں کو جگہ دی۔

نظم کا سنہرا اور جدید دور ۱۸۵۷ء کے بعد شروع ہوتا ہے۔اس دور میں نظم کے کینوس میں بہت وسعت پیدا ہوگئی اور نظم کو قومی اصلاح اور تربیت کا ایک مؤثر ذریعہ سمجھنے کی حیثیت سے خاص اہمیت دی گئی۔بالخصوص آزادؔ اور حالیؔ کی کوششوں سے نظم نے ترقی کی ایک اور کروٹ لی۔جس میں بہت نئے خیالات اور موضوعات نے جگہ پائی۔اس زمانے کے ایک اور اہم شاعر اکبرؔ الہ آبادی بھی ہے جس کا کلام اُس عہد کا آئینہ دار ہے۔اکبرؔ نے اپنی نظموں میں مغربی تعلیم، تہذیب ومعاشرت کی پرزور مذمت کی ہے۔حالیؔ نے جدید نظم کی جو بنیاد رکھی تھی اُس پر علامہ محمد اقبال نے نظم کی ایک ایسی عمارت کھڑی کردی جس کے بنا پر اقبالؔ اُردو کے ایک معتبر نظم گو شاعر کہلانے لگے۔

قیام پاکستان کے بعد اُردو شعری اُفق پر ایسے ستارے نمودار ہوئے جنہوں نے اُردو نظم کو بام گردوں سے ہمکنار کرنے کی ایک کامیاب کوشش کی۔قیام پاکستان کے بعد اُردو نظم نے خوب ترقی

کی نظم کے دامن کو مزید وسعت ملی اور بہت سے سماجی ،معاشی،معاشرتی اور تہذیب رجحانات اور موضوعات کو جگہ دی گئی۔نظم کے حوالے سے اس دور میں فیض احمد فیضؔ،احمد ندیم قاسمیؔ، جوش ملیح آبادی،حفیظ جالندھری اور اختر لایمان جیسے شعرا قابلِ ذکر ہیں۔

اُردو نظم کے حوالے سے اس عہد نو سے تعلق رکھنے والا ایک اہم شاعر،شاعرؔ صدیقی بھی ہیں۔ شاعرؔ محض غزل یا نظم کا شاعر نہیں بلکہ ایک اعلیٰ پائے کا نظم نگار بھی تسلیم ہو چکے ہیں۔اُن کی نظموں کا یہ محدود سرمایہ اپنے دور کا وہ دریچہ ہے جس میں اُس عہد کے تمام واقعات ،سانحات اور دیگر سماجی ، معاشرتی،تہذیبی رجحانات کو دیکھے جاسکتے ہیں۔ان کی نظم متنوع موضوعات پر مشتمل ہیں۔جن میں قومی وملی،انقلابی،زندگی کی بے ثباتی،سقوط ڈھاکا،اتحاد اُمت جیسے کئی رنگ شامل ہیں جو اُن کے عصری شعور کے مظہر ہیں۔شاعرؔ صدیقی کی بعض نظمیں اس بات کا واضح پتہ دیتی ہے کہ اُن کی فکر واُسلوب پر فیضؔ کا رنگ شاعری نمایاں ہے۔لیکن اس کے باوجود انہوں نے تقلیدی روش سے اپنے دامن کو بچانے کی بھرپور کوشش کی ہے اور اپنے لیے ایک الگ راستے کا انتخاب کیا ہے۔

سقوط ڈھاکا

۱۹۷۱ء کے بعد پاکستان کو درپیش واقعات میں سب سے بڑا اور انسانیت سوز واقعہ سانحہ مشرقی پاکستان ہے۔المیہ سقوط ڈھاکا میں قتل عام اور ظلم اور بربریت کے ایسے مناظر دیکھنے کو ملے ہیں جن کی نظیر پوری دنیا میں نہیں ملتی۔ان ناگفتہ بہ حالات کے تلخ اثرات معاشرے کے ہر خاص وعام پر پڑنے کے ساتھ ادب نے بھی قبول کیے۔اور بطورِ خاص وہ اہل قلم طبقہ جو ذاتی طور سے اس کرب سے گزر چکے تھے۔یہی وجہ ہے کہ اُس عہد سے وابستہ شعرا کے کلام میں اس کی جھلک کسی نہ کسی صورت میں ضرور دکھائی دیتی ہے۔شاعرؔ صدیقی جیسے حساس اور دردمند دل رکھنے والے شخصیت کے لیے اس کرب کو نظر انداز کرنا ممکن نہ تھا۔دیگر شعرا کے مقابلے میں شاعرؔ صدیقی کے لیے یہ حالات زیادہ تکلیف دہ اور کٹھن ثابت ہوئے۔اُن کا شعری مجموعہ ''پانی کا ملک پتھر کے لوگ'' اس دو آتشہ کے تناظر میں لکھا گیا ہے۔اس المیے نے شاعرؔ صدیقی کو ذہنی طور پر مفلوج کر دیا تھا۔وہ اپنی رُوداد بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''سانحہ مشرقی پاکستان یعنی ڈھاکا کا فال ہونے کے بعد ۱۹۷۲ء میں

جب میں جان بچا کر اور اپنا سب لُٹا کر (اپنے ایک معتبر دوست شمس الدین مامون جو مکتی باہنی کا سیکٹری انچارج بھی تھا) کی مہربانی اور دست نوازی کی وجہ سے کلکتہ سے اپنی مختصر سی فیملی کے ساتھ پہنچا ہی تھا کہ ایک اور سانحے نے مجھے بالکل توڑ کے رکھ دیا۔ جس کے نتیجے کے طور پر میں ''نیم پاگل'' ہوگیا تھا۔ اس سانحہ کا تعلق مال و دولت اور نام و نمود سے نہیں بلکہ خاص دل و دماغ سے تھا جس کی وجہ سے میں اپنے ہوش و حواس تقریباً کھو چکا تھا'' (۱)

اس سانحے میں شاعر صدیقی کے کلام کا بیشتر سرمایہ مسودوں کی شکل میں ضائع ہوگیا۔ جس میں گیتوں کے علاوہ نثر کی کتابیں بھی شامل تھیں۔ اس وجہ سے وہ معاشی طور پر بدحالی کے شکار ہوگئے۔ یہاں تک کہ اُنہوں لکھنا بھی ترک کر دیا۔ اس حوالے سے شاعرؔ صدیقی تحریر کرتے ہیں:

''سانحہ مشرقی پاکستان کی وجہ سے میں اس قدر دل برداشتہ ہوا کہ لکھنے پڑھنے سے دل اُچاٹ ہوگیا تھا اور میں نے ادب لکھنا ترک کر دیا'' (۲)

مشرقی پاکستان کے دیگر ادیبوں اور شاعروں کے کلام سے اس آسیب زدہ دور کی کچھ نہ کچھ نقوش ضرور عیاں ہوتے ہیں لیکن شاعر نے اس سانحے کو کچھ زیادہ سنجیدگی سے لیا تھا یہی وجہ ہے کہ اُن کا ایک مکمل مجموعہ اس دور کا عکس ہے انور فرہاد اس حوالے سے اظہار خیال کرتے ہوئے یوں رقم طراز ہیں:

''شاعرؔ صدیقی طبیعتاً بہت زیادہ حساس ہیں اس لیے وہ اس المیے سے بہت زیادہ متاثر ہوئے اور یہ اس کا نتیجہ ہے کہ انہوں نے اس دور میں جو کچھ کہا ہے اس میں اس دور کا دکھ بہت واضح نمایاں ہے۔ اس دور کی یادگار ان کا غیر مطبوعہ کلام ''پانی کا ملک پتھر کے لوگ'' ہے۔ جو حقیقتاً نظم نہیں بلکہ کئی نظموں کا مجموعہ ہے۔'' (۳)

معاشرتی، سیاسی انتشار اور بدامنی ابتدا ہی سے اُن کی شاعری کا محور رہا ہے کیوں کہ شاعرؔ صدیقی

کی شاعری ۱۹۴۷ء کے ہندو مسلم فسادات سے لے کر سقوط ڈھاکا کا احاطہ کرتے ہوئے عہد حاضر میں کراچی کے بدامنی پر اپنے پایہ تکمیل تک پہنچتی ہے۔لیکن اُن کے ہاں جو کرب سب سے زیادہ نمایاں طور پر دکھائی دے رہا ہے وہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا ہے۔کیوں کہ مشرقی پاکستان میں اُردو بولنے والے خاص کر مہاجروں پر قتل و غارت گری اور جو مظالم کے پہاڑ ڈھائے گیے ان تین سالوں کے روداد یعنی ۱۹۷۱ء سے ۱۹۷۳ء تک بہ تفصیل بیان کیے گیے ہیں۔

۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان جن بدتر حالات سے گزرا شاعرؔ صدیقی نے وہ دردناک حوادث بہت قریب سے نہ محض دیکھے ہیں بلکہ ان حالات سے بذات خود گزر بھی چکے ہیں۔اس حوالے سے یہ اشعار دیکھئے۔جس میں خون کی ہولی کھیلتی ہوئی دکھائی دے رہی ہے۔

یہ سولہ دسمبر کی وہی رات ہے اے دوست
جس رات میں پانی کی طرح خون بہا ہے
یہ واقعہ تاریخ میں ہے اپنی مثال آپ
انسان نے شرمندہ درندوں کو کیا تھا
(۴)

پرچھائیاں بن بن کے اُبھرتے ہیں مناظر
وہ خونی مناظر کہ نظر کانپ رہا ہے
وہ خون، وہ خنجر ، وہ تڑپتی ہوئی لاشیں
پھر آج ہر ایک راہ گزر کانپ رہا ہے
(۵)

تصویر قیامت ہے یہ سولہ دسمبر
تاریخ نہ دہرائے کبھی سولہ دسمبر
(۶)

اس دور کے قیامت خیزی اور تڑپا دینے والے مناظر نمایاں طور پر شاعرؔ صدیقی کے اشعار میں

عیاں ہیں۔ اُن کی نظموں میں خون میں لت پت معصوم لاشیں، تلواریں اور بندوقیں بہ دست جلاد، بندوق کی نالی سے اُگلتی ہوئی آگ اور جسموں سے خون کے دھارے نکلتے ہوئے دکھائی دے رہے ہیں۔ شاعرؔ صدیقی ایک جگہ پہ لکھتے ہیں کہ مجھے ایسے مناظر دیکھنے کو ملے جن کو بیان کرنا میرے دسترس سے بالاتر ہے۔

بنگالیوں کی طرف سے مہاجر اور اُردو بولنے والوں پر جو ظلم اور بربریت کے پہاڑ ٹوٹے اور اُن کا خون پانی کی طرح جس طور سے بہایا گیا کہ چنگیزیوں کے ظلم کی مثال ایک بار پھر زندہ کی گئی۔ وہی حالات شاعرؔ کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں:

بولتے ہیں یہ پیار کی بولی
کھیلتے ہیں یہ خون کی ہولی
ہیں یہ انسانیت سے بے بہرہ
رنگ چنگیزیت کا ہے گہرا
ظلم کرنے میں اس قدر ہیں تیز
سچ ہے کہیے جو وارث چنگیز
ظلم کی ان کے ایک زندہ مثال
ہے یہ انیس سو اکہتر سال

(۷)

مشرقی پاکستان کی گلی کوچوں میں تڑپتی ہوئی لاشیں اور قتل و غارت کی بازار گرمی کا ذکر کرتے ہوئے مزید لکھتے ہیں:

خون ہی خون ہے نگاہوں میں
مسجدوں میں گھروں میں راہوں میں
خونِ انسانیت سے کھیت ہے سرخ
اور سمندر کی ساری ریت ہے سرخ

ہر طرف خون ہے مہاجر کا
بھاگ جاگا لہو کے تاجر کا
(۸)

برصغیر کی تاریخ کا وہ المیہ جس میں خود مسلمانوں نے ایک دوسرے کا خون پانی کی طرح بہایا۔قتل عام،ظلم اور بربریت کے وہ مناظر دیکھنے کو ملے کہ تاریخ اقوام میں ان کی مثال ڈھونڈنا محال ہے۔شاعرؔ صدیقی ساری زندگی اس المیہ کے کرب سے نہیں نکل پائے اس موضوع کو اگر ان کی شاعری کا محور کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔یہ المیہ اگر ایک طرف مسلمانوں کی تاریخ کی ایک عبرت انگیز داستان ہے تو دوسری طرف شعری پیکر میں ان حالات وواقعات کا اظہار اُن کے کلام میں ایک الگ باب کی حیثیت بھی رکھتا ہے۔انہوں نے انسانی اقدار کی شکست اور ظلم وتشدد،سیاست دانوں کی سازش،عیاری،دغابازی اور منافقت کو جس طور سے بیان کیا ہے،اردو شاعری میں اس کی مثال ڈھونڈنا شاید مشکل ہو۔مشرقی پاکستان میں اُنہیں ایک پرسکون ماحول میسر آ گیا تھا لیکن بہت جلد ظلم واستبداد کے ایک ایسے خباثتوں نے سر اُٹھایا کہ مسلمان نے مسلمان کے خون کی ہولی کھیلی۔شاعرؔ صدیقی کے کلام کو پڑھ کر یہ درد اچھی طرح محسوس کیا جاسکتا ہے۔

حبِ وطن

وطن سے محبت کرنا ہر انسان کا فطری خاصا ہے۔خاص کر وہ مٹی جہاں انسان کا بچپن اور جوانی گزری ہو انسان اس سے بے حد پیار کرتا ہے۔وطن سے محبت ایمان کا حصہ سمجھا جاتا ہے۔انسان کی آزادی وطن سے محبت کا متقاضی ہے۔بلند پایہ شاعر اور ایک اچھے انسان ہونیکا ساتھ ساتھ شاعرؔ صدیقی ایک محبِّ وطن شہری بھی ہے۔اُن کو وطنِ عزیز سے بے پناہ محبت ہے۔جس کا اظہار انہوں نے اپنے ہر دور کی نظموں میں کیا ہے۔وطن سے جدا ہونے کا دکھ انہیں عمر بھر رہا ہے۔اکرم کنجاہی شاعرؔ صدیقی کی حب الوطنی کے حوالے سے یوں لکھتے ہیں:

> ''اپنے دیس کے صحرا،پربت،مست سمندر،دریا،ندیاں،اور جھرنے گویا ذرّہ ذرّہ شاعر کی آنکھ کا تارا ہے۔دھرتی ماں کی طرح ہوتی ہے اور ماں سے پیار کس کو نہیں ہوتا۔دیس کا ہر موسم پیارا لگتا ہے۔بادل

تو بادل لو بھی اچھی لگتی ہے۔ پردیس میں ہیرے موتی کیوں نہ مل جائیں اپنا وطن تو خوبصورت جزیرے کی طرح ہوتا ہے۔ شاعرؔ کو شام کی لالی سہاگن کی جوڑے کی طرح اور بھورے سمے چڑیوں کا چہکنا سہانے گیتوں جیسا لگتا ہے۔ اپنے وطن میں جب کا چاند جھیل پر اُترتا ہے تو وہ منظر محسور کر دیتا ہے۔ سورج کی کرنیں جب پربتوں کو چومتی اور دمن میں اُترتی ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ دھرتی اور آکاش میں ضرور کوئی گہرا رشتہ ہے۔ شاعرؔ صدیقی نے غزل نظم گیت اور جنگی ترانے لکھ کر وطن سے بے پایا محبت کا اظہار کیا ہے'' (۹)

شاعرؔ صدیقی کی ابتدائی زمانے کی شاعری سے لیکر عہد حاضر تک ان کے کلام میں وطن سے محبت کا جذبہ کارفرما نظر آتا ہے۔ دو ہجرتوں کا دُکھ سہہ کر اُنہیں اپنے وطن کی اہمیت اندازہ ہو گیا۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی شاعری میں مٹی سے اُن کی محبت شدت سے محسوس کی جاسکتی ہے۔ وطن کے وجود پر اُن کا دل دُکھتا ہے۔ اس لیے وطن میں بدامنی، نفرت، عداوت، غربت و افلاس کو جب وہ دیکھتے ہیں تو کُڑھتے ہیں اور وطن کے پراگندہ نظام کو بدلنے اور امن و آشتی کا ماحول بنانے کی آرزو رکھتے ہیں۔ اپنے ابتدائی دور کی شہرہ آفاق نظم ''مادر ہند سے'' میں مادر ہند سے محبت کا اظہار کچھ اس طرح کرتے ہیں:

مادر ہند تیری حشمت و عظمت کی قسم
تیری عزت کی قسم تیری محبت کی قسم
شکل سیلاب مچلتی ہوئی نفرت کی قسم
تیرے ہر گوشے کی خوں ریز حکایت کی قسم
ہم بدل دیں گے زمانے کا پراگندہ نظام
(۱۰)

شاعرؔ صدیقی جب مشرقی پاکستان کے ہولناکیوں سے گزرے اور کراچی میں رہائش اختیار کی تو اس شہر سے اُن کو فطری لگاؤ اور دلی وابستگی پیدا ہو گئی لیکن افسوس کہ یہاں بھی شاعرؔ کو اطمینان نصیب نہیں ہوا

کیوں کہ یہ شہر بھی وہی خون ریزی، قتل وغارت، عصمت دری اور لٹیروں کا گڑھ تھا۔ جس کی وجہ سے یہاں کی روشنیاں غارت ہوگئیں تھیں۔ اور سڑکیں سنسان اور گلیاں ویران پڑی تھیں۔ شہر کا ہر باسی خوف وہراس اور آسیب میں مبتلا نظر آتا ہے۔ شاعر نظم ''شہر کو ہ ندا'' میں اس شہر سے والہانہ محبت کا اظہار کچھ یوں کرتے ہیں:

اے مرے شہر

اے روشنی کے شہر
تجھ کو کس کی نظر کھا گئی
تیری راتوں پہ ہوتا تھا دن کا گماں
ہر طرف نغمہ ورنگ کا کارواں
مثل آب رواں
زندگی ہر قدم پہ جواں
تیری ہر رہ گزر مثل کاہکشاں
اب کہاں۔۔۔۔۔۔۔اب کہاں؟(۱۱)

شاعرؔ صدیقی اپنی سرزمین سے جتنا پیار کرتے ہیں اُتنا ہی وطن کے محافظوں سے بھی کرتے ہیں۔ جنہوں نے جذبہ شوق شہادت لے کر پاک بھارت جنگ میں وطن کی حفاظت میں اسلاف کی تاریخ کو ایک مرتبہ پھر زندہ کیا تھا۔ جن کو نذر عقیدت پیش کرتے ہوئے شاعرؔ صدیقی ایک نظم میں مجادین وطن کو نذرِ عقیدت پیش کرتے ہوئے یوں پکارتے ہیں:

مجاہدان وطن اے مجاہدان وطن
تمہیں وطن کی فضائیں سلام کہتی ہے
ہمالیہ کی چٹانوں کو رشک ہے تم پر
تمہیں تمہاری وفائیں سلام کہتی ہیں

پھر ایک بار زمانے پہ کردیا روشن
حسین و خالد و طارق کی یادگار ہو تم
صدائے حق کبھی باطل سے دب نہیں سکتی
نقیبِ امن وامان وقت کی پکار ہو تم
(۱۲)

شاعرؔ صدیقی نے وطن سے ماں کی طرح پیار کیا ہے۔ وطن کی گود اُن کے لیے سب سے بیش قیمت شے ہے۔ انہیں اپنا وطن پوری کائنات میں حسین لگتا ہے۔ دیس کی جھومتی گھٹا، کوہسار صف بہ صف، مسکراتی وادیاں، گنگناتی ندیوں کا بانکپن اور ڈولتی ہوئی بہار کی کلیوں نے شاعرؔ کو اپنا اسیر بنالیا ہے جس کا ذکر انہوں نے ایک نظم میں بہت دل فریب انداز میں کیا ہے۔

مرے وطن کی سرزمیں۔۔۔۔۔۔۔
مرے وطن کی سرزمیں، ترا جواب ہی نہیں
جہاں میں تیری گود سے نہیں کوئی شے حسیں
مرے وطن کی سرزمیں
یہ جھومتی ہوئی گھٹا، قدم قدم رواں رواں
یہ کوہسار صف بہ صف، یہ مسکراتی وادیاں
چناب وسندھ کی یہ گنگناتی ندیاں
یہ ندیوں کا بانکپن نظر نواز دل نشیں
مرے وطن کی سرزمیں (۱۳)

مندرج بالا اشعار سے اُن کی حب الوطنی کا اندازہ بخوبی لگا جاسکتا ہے۔ یہ محبت اُن کی رگ وپے میں بسی ہوئی ہے۔ شاعرؔ صدیقی بھی فیض کی طرح وطن کو اپنے محبوب سے کم تر نہیں سمجھتا۔ جہاں انہوں نے محبوب سے ہجر وفراق کا اظہار کیا وہاں وطن عزیز سے جدائی کا درد بھی جلوہ گر ہے۔ وہ وطن اور وطن کی مٹی سے وابستہ ہر چیز سے بے پناہ اُلفت رکھتے ہیں۔ اُنہوں نے وطن کی بربادی اور اور تنزلی پر ہمیشہ

خون کے آنسو بہائے ہیں۔ہم وطنوں کی خستہ حالی،مفلسوں کی بے بسی اور ناداری،قوم کی عزت وناموس،بھوک اور خون کی ارزانی کو جب دیکھتے ہیں تو تڑپتے ہیں۔وطن اُن کی بیشتر نظموں اور گیتوں کا موضوع رہا ہے۔شاعرؔ صدیقی اگر وطن سے پیار نہ کرتا تو اُن کی وہ شاعری جو ہجرت اور سقوط ڈھاکا کے تناظر میں ہے درد و کرب اور تاثیر کی حامل کبھی نہ ہوتی۔جس کو وہ اپنی زیست کا سب سے بڑا المیہ سمجھتے ہیں۔

عزم و انقلاب

روایتی ڈگر پر چلنے کے ساتھ شاعرؔ صدیقی ترقی پسند سوچ کو لے کے آگے بڑھ چکے ہیں۔ترقی پسندوں کے تمام تر مثبت افکار اُن ہاں دیکھے جاسکتے ہیں جن میں عزم و انقلاب کا جذبہ بھی نمایاں ہے۔اس حوالے سے وہ فرار اور بغاوت کا قائل نہیں ہیں بلکہ زندگی کی حقیقت کا سامنا کرنا اُن کا وطیرہ ہے۔اُن کو بیک وقت رومان اور انقلاب کا شاعر کہا جاسکتا ہے کیوں اُن کے ہاں مقصدیت،رومانیت،خارجی اور داخلی واردات قلبی مشترک طور پر نمایاں ہیں۔جو اُن کی فکر کے دو خوبصورت جھروکے ہیں۔

شاعرؔ صدیقی نے معاشرتی استحصال،ظلم و جبر اور ناانصافی کے خلاف آواز اُٹھانا اپنا دین سمجھا ہے۔وہ وطن دوستی اور محبت و رواداری کا درس دیتے ہوئے فرسودہ نظام کو بدلنے کی خواہش رکھتے ہیں۔وہ غلامی کو موت سے بھی سخت تر سمجھتے ہیں۔آزادی سے محبت اور غلامی سے نفرت اُن کی سرشت میں شامل ہے۔

شعری سفر میں شاعرؔ صدیقی کی فکری رجحانات میں حالات کی مناسبت سے تغیرات رونما ہوئے ہیں۔کبھی انہوں نے انقلاب سے رمان کی طرف سفر کیا ہے اور کبھی رومان سے انقلاب کی جانب۔اگرچہ ابتدائی دور کی شاعری کو دیکھا جائے تو اس میں ایسے اشعار کافی تعداد میں موجود ہیں جو اُن کی انقلابی طرزِ فکر کی کے ترجمان ہیں اسی طرح مشرقی پاکستان میں قیام کے دوران جو شاعری انہوں نے کی ہے خاص کر گیت نگاری کو اگر دیکھا جائے تو اس میں رومانیت،نسوانیت نسوانی اُمنگوں آرزوؤں، فراق،وصل جدائی اور دخلی واردات کا غلبہ دیکھا جاسکتا ہے۔اس سلسلے میں امیر حسین چمن یوں لکھتے ہیں:

> ''قدرت نے پوری فیاضی کے ساتھ شاعرؔ صدیقی کو تخلیقی صلاحیتیں
> ودیعت کی ہیں۔معاملات حسن و عشق ہو یا سسکتی زندگی کی تلخ حکایات۔
> اُنہوں نے اپنے عہد میں ہونے والے تمام تر انسانی اور تہذیبی شکست

وریخت جس سے وہ خود بھی متاثر ہوئے، اپنے احساس اور جذبات کو فکر اور جذبے کے ماہرانہ توازن کے ساتھ اس طرح اپنی شاعری میں سمو دیا جیسے ہر ٹوٹے دل کا دکھ، آنسو بن کر ان کی آنکھ سے بہہ نکلا ہو'' (۱۴)

خواجہ ریاض الدین عطشؔ نے اس ضمن میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے یوں لکھا ہے:

''ان کی شاعری حسن و عشق کی داخلیت تک ہی محدود نہیں بلکہ ان کا شعور اپنی ان کے شعور سے باہر نکل کر کہیں سسکتی انسانیت کہیں معاشرہ کی بدحالی، کہیں اخلاقیات کی زوال پذیری کہیں ملک کی سماجی ابتری کہیں قوم کی زبوحالی غرض کہ ان کی شاعری اپنی ذات اور اپنے حالات پر پئے بہ پئے گزرے ہوئی پامالی کے ادوار اور اس کے سوز کے ساتھ بہت سے دوسرے دکھ درد کو بھی شامل مضمون رکھتی ہیں'' (۱۵)

شاعرؔ صدیقی نے وطن کے نوجوانوں کو آزادی، مساوات اور حب الوطنی کا پیغام دیا ہے۔ انہوں نے ہر دور میں ظلم کے خلاف آواز اُٹھائی اور اُس کے خلاف عزم کو اپنا دھرم و ایمان سمجھا ہے۔ اُن کے ہاں غم جاناں کے مقابلے میں غم دوراں کا پلڑا بھاری رہا ہے۔ شاعرؔ کے ابتدائی دور کے چند اشعار دیکھئے جن میں اُن کا انقلابی شعور کو دیکھا جا سکتا ہے:

میرے محبوب میرے فکر تخیل پہ نہ جا
مجھ کو ماضی کے تصور سے نہ غمگین بنا
نہ سنا مجھ کو محبت کے ترانے نہ سنا
ہاں بدلنی ہے ابھی دہر کی حالت مجھ کو
میرے محبوب نہ دے دعوت عشرت مجھ کو
(۱۶)

ساری دنیا کے غریبوں کو جگانا ہے مجھے
انقلاب ایک نیا دہر میں لانا ہے مجھے

زیست کو موت کے پنجے سے چھڑانا ہے مجھے
ختم کرنی ہے بہیمانہ حکومت مجھ کو
میرے محبوب نہ دے دعوت عشرت مجھ کو
(۱۷)

شاعرؔ درج بالا اشعار میں اپنے محبوب سے مخاطب ہے کہ اب مجھے تیری ضرورت نہیں ہے کیوں کہ میرا مقصد محض تجھ سے محبت و اُلفت نہیں ہے بلکہ ملک سے غربت و افلاس ختم کر کے مجھے غاصب اور بہیمانہ حکومت کو بھی ختم کرنا ہے۔اس ضمن میں مزید اشعار ملاحظہ کریں جن میں شاعر نے مجاہدانِ وطن کو خراج عقیدت پیش کیا ہے:

شبوں کے راج دلاروں کو فکر ہے شب کو
لہوں کو دیپ جلائے ہیں تم نے راہوں میں
ہے کون ایسا جو اب روک لے تمہارا قدم
بہار منزل مقصود ہے نگاہوں میں

بھلا سکے گی نہ تاریخ عظمت آدم
تمہیں سے آیا ہے عالم میں انقلاب نیا
جہاں جہاں بھی گرے گی تمہارے خون کی بوند
وہاں وہاں سے طلوع ہوگا آفتاب نیا
(۱۸)

شاعرؔ صدیقی نے اپنی نظموں میں دیس کے محنت کشوں کو بھی عزم و اتحاد اور حوصلے کا درس دیا ہے جنہوں نے اپنے خون سے اس دھرتی کی آبیاری کی ہے۔جو فصلیں کاٹ کر بھی فاقے کاٹ رہے ہیں۔شاعرؔ انہیں ظلم کے خلاف چٹان بننے کی تلقین کرتے ہوئے کہتے ہیں:

صدیوں اپنے خون سے اس دھرتی کو سینچا ہم نے
لیکن فصلیں کاٹ کے بھی ہم سدا رہے ہیں بھوکے
جس میں اونچ اور نیچ ہو ساتھی توڑ دو وہ فرمان
روک سکے تو روک لے کوئی یہ بڑھتا یہ طوفان
ہاتھ سے ہاتھ ملا کر رکھنا دیکھو چھوٹ نہ جائے
دور نہیں سپنو ں کا سویرا ہمت ٹوٹ نہ جائے
ظلم کی ہر آندھی کے آگے بن جاؤں چٹان
جاگ اُٹھے ہیں اس دھرتی کے محنت کش انسان
(۱۹)

رومان پسند شعرا کے ہاں انقلابی رجحان کسی نہ کسی صورت میں ضرور کارفرما ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شاعرؔ محض رومانی شاعر نہیں بلکہ ایک انقلاب پسند شاعر بھی مانے گئے ہیں۔ وہ انقلاب برپا کرنے کی خواہش مند ہے۔ وہ مکر وفریب، ظلم و جبر، اور منافقت کی دنیا کو بدلنا چاہتے ہیں۔ سماج کے رنجیدہ مسائل خاص کر انسانوں کے کشت وخوں، بدامنی، انتشار، انفراق سے دل برداشتہ ہوکر وہ یادِ ماضی کی طرف پلٹ جاتے ہیں۔ لیکن پھر منحرف ہوجاتے ہیں اور سماج کی نبض پر ہاتھ رکھ کر رومان اور انقلاب کی کشمکش میں پھنس جاتے ہیں۔ شاعرؔ صدیقی نے فیض احمد فیضؔ کی طرح اپنے ایک ہتھیلی پر رومان اور دوسری پر انقلاب کا دیپک فروزاں کیا ہے۔ جس کی وجہ سے اُن کے کلام میں شگفتگی کے ساتھ رنگینی اور لہجے میں غنائیت اور تاثیر بھی پیدا ہوگئی ہے۔

فلسفہ زندگی

زندگی کیا ہے اور اس کی حقیقت کیا ہے ہر شاعر اور ادیب نے اپنی فہم وفراست اور فکر کے بل بوتے پر اس کی تشریح وتوضیح کی ہے۔ کسی کے نزدیک پانی کا بلبلا ہے تو کسی نے ماندگی کا وقفہ قرار دیا ہے اور کسی نے جبر مسلسل سمجھی ہے۔ غالبؔ کے نزدیک زندگی غموں کا گہوارا ہے جس سے سوائے موت کے فرار حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ بہر حال زندگی کے تصور نے ہر دانشور کے ہاں ایک الگ روپ دھارلیا

ہے۔ ہر انسان زندگی کو اپنے سمجھ بوجھ کے آئینے میں دیکھتا ہے اور پرکھتا ہے۔ کسی کے لیے کرب کی گھڑی ہے تو کسی لیے عشرت اور مسرت کی۔

بہر کیف ایک شاعر زندگی کو اپنی بصیرت اور بصارت کی بنیاد پر جس طرح مختلف زاویوں سے دیکھتا ہے اور پرکھتا ہے اسی طرح زندگی کی باریکیوں کو بھی اپنے شعر کے آئینے میں پیش کرنے کی کوشش میں مگن رہتا ہے اور زندگی کے پوشیدہ گوشوں کو بے نقاب کرنے کوشش کرتا ہے۔

شاعرؔ صدیقی کا سامنا ہمیشہ سے زندگی میں محرومیوں اور ناکامیوں کے ساتھ رہا ہے۔ لیکن پھر بھی انھوں نے زندگی کو قابل قدر سمجھا اور کبھی بھی مایوسی کے شکار نہیں ہوئے ہیں۔ شاعر نے زندگی کو اپنے فکر کے چراغ کی پرتوں کے موافق زندگی کو کبھی زہر ہلاہل کہا ہے اور کبھی جام شراب تصور کیا ہے۔ زندگی اُن کے لیے کبھی ایک انمول موتی کی مانند ہے اور کبھی کانچ کا ٹکڑا۔ ان کا کہنا ہے کہ زندگی اگر خوشیوں اور مسرتوں کی بیچ سے گزرتی ہے تو پھولوں کا تاج ہے۔ اگر رنج والم کا گہوارا بنے تو پھر کانٹوں کے بستر کے سوا کچھ بھی نہیں۔ اس حوالے سے اُن کی نظم ''زندگی نامہ سے چند اشعار ملاحظہ کیجئے:

بے خودی جاتی ہے اور آتا ہے انساں ہوش میں
زندگی جب کھیلتی ہے موت کی آغوش میں

زندگی ہے اک حقیقت، زندگی ہے ایک خواب
زندگی زہر ہلاہل ، زندگی جامِ شراب

زندگی شبنم کا نغمہ زندگی شعلوں کا ناچ
زندگی انمول ہیرا، زندگی بس ایک کانچ
(۲۰)

شاعرؔ صدیقی کے نزدیک زندگی اللہ کی جانب سے انسان کے لیے ایک بیش قیمت نذرانہ ہے یہ زندگی اللہ کی نعمتوں میں سب سے بڑی نعمت ہے۔ وہ زندگی کی قدر و منزلت کے قائل ہیں۔ اُن کے ہاں

زندگی خوشی، مسرت اور محبت کا نام ہے لیکن ہم نے اسے ایک ظالم سماج کے روپ میں تبدیل کی ہے۔ زندگی جنت کی خوشبو ہے لیکن ہم نے اپنے لیے دوزخ کی آگ بنادی ہے۔ زندگی کی حقیقت کو بیان کرتے ہوئے شاعرؔ صدیقی نے مزید کچھ یوں بیان کیا ہے:

زندگی پھولوں کا بستر، زندگی کانٹوں کا تاج
زندگی اللہ کی نعمت، زندگی ظالم سماج

زندگی سینے کی دھڑکن، زندگی پائل کا گیت
زندگی خاموش دیپک، زندگی بھونرے کی جیت

زندگی جنت کی خوشبو، زندگی دوزخ کی آگ
زندگی بیوہ کا سپنا، زندگی ہنستا سہاگ

(۲۱)

بعض جگہوں پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعرؔ صدیقی نے غالبؔ کی طرح زندگی کو محض جاگتے لمحوں کا عذاب سمجھا ہے۔ لیکن شاعرؔ کے ہاں ایک مثبت پہلو یہ نظر آتا ہے کہ انھوں نے اصل زندگی وہ سمجھی ہے جو حق گوئی اور سچائی کے لیے بیت جائے اور جس میں ابن آدم کا احساس رکھا جائے۔

زندگی جاگتے لمحوں کا عذاب
بند ہونٹوں میں سسکتی ہوئی
حق کی آواز
ایک نئے دور کا خاموش آغاز
دست در دست تہ سنگ
نگاہیں پُرنم
ابنِ آدم کا بھرم (۲۲)

شاعرؔ صدیقی کی نظموں میں زندگی کا گہرا مطالعہ ملتا ہے۔انہوں زندگی کو اپنے مشاہدات، تجربات، تخیلات بلکہ ہر زاویے سے دیکھنے اور پرکھنے کی کوشش کی ہے اور زندگی کی حقیقی تصویر کو نمایاں کی ہے کہ اصل میں زندگی کیا ہے اور اس کا بنیادی مقصد کیا ہے۔اُن کا عقیدہ یہ ہے کہ دنیا میں انسانی روحیں محض پیار کے لیے ہیں۔نفرت کو وہ زندگی کا حصہ نہیں سمجھتے اُن کے نزدیک زندگی کا حاصل پیار و محبت ہے۔کیوں کہ وہ فطری طور پر پیار کا پیاسا ہے۔اُن کا کہنا ہے کہ زندگی میں خوشی اپنانا چاہیے اور ہر لمحہ خوشی کیساتھ گزارنا چاہیے۔

بذات خود شاعرؔ صدیقی کا ماضی زندگی کی ناہمواریوں اور تلخیوں سے عبارت ہے لیکن اُن کے ہاں مایوسی قطعاً نہیں ہے۔کیوں کہ وہ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ رنج والم، دکھ اور تکلیف زندگی کا حصہ ہے۔شاعرؔ صدیقی کہتا ہے کہ زندگی انسان کے ہاتھ ایک مہرہ ہے جسے جس طرح چاہے گزار سکتا ہے۔ زندگی ناول بھی ہے اور قرآن بھی زندگی ایک حیوانی روپ بھی ہے اور انسانیت بھی۔

حق گوئی

کوئی بھی فن پارہ اس وقت تک زندہ نہیں رہ سکتا جب تک اس کو حق گوئی، سچائی اور بے باکی سے ہمکنار نہ کیا جائے۔اسی سبب شاعر معاشرے میں ایک امتیازی حیثیت کا حامل ہوتا ہے کیوں کہ معاشرے کو حق کا پیغام دینا اور سدھارنے کی ذمہ داری معاشرے کے دوسرے افرد کے بہ نسبت ایک شاعر اور ادیب پر زیادہ عائد ہوتی ہے کیوں کہ وہ دیگر افراد سے زیادہ دور اندیش اور بابصیرت ہوتا ہے۔ ان ذمہ داریوں کو کوئی نبھاتا ہے اور کوئی نہیں، لیکن جو بھی ہو وہ کسی نہ کسی صورت میں اپنے خارجی یا داخلی عوامل کو مشاہدات اور تجربات کی روشنی میں زندگی کی اصلیت، ماہیت، اور حقائق کی نشاندہی کرتے ہیں۔

شاعرؔ صدیقی اپنے عہد میں حق کی تلقین کو اپنا مطمع قرار دینے والوں میں ایک نمایاں نام ہے۔ شاعرؔ صدیقی کے اشعار محض گل وبلبل کے مضامین تک محدود نہیں بلکہ اس میں جو وصف زیادہ نمایاں ہے وہ حق گوئی اور بے باکی ہے جس کا اعتراف تقریباً بیشتر ناقدین نے کیا ہے اور سچائی کو اُن کے کلام کا بنیادی وصف قرار دیا ہے۔سماج کے تمام تر تلخ حقائق کا ذکر اُن کی نظموں میں نظر آتا ہے۔انھوں نے قوم کی بے بسی اور ظلم کے خلاف حق کی آواز کو بلند کیا ہے۔ترقی پسند فکر سے وابستگی کے بنا پر شاعرؔ صدیقی کے ہاں یہ عکس اپنی پوری آب تاب

کے ساتھ جلوہ گر ہے۔اس ضمن میں شاعرؔ صدیقی کی فکر فیض احمد فیض سے مماثلت رکھتی ہے کیوں کہ شاعرؔ نے حق گوئی اور سچائی کے ساتھ ساتھ غم جاناں کا بھی خیال رکھا ہے۔اس سلسلے میں شبیر ناقد یوں رقم طراز ہیں:

''شاعرِ موصوف کے ہاں حقیقت پسندی کا غالب عنصر نظر آتا ہے کچھ تلخ حقائق کا بیان ذیشان ہے ان کے ہاں عندالبیاں مفلوک الحال طبقے کی غمازی ملتی ہے جو ان کی ترقی پسند فکر کی ترجمان ہے ان کی زیست کے تجربات مشاہدات کی عکس جمیل بھی ہے غم ہستی کے پہلو بہ پہلو غم جاناں کے شواہد بھی بھرپور انداز میں پائے جاتے ہیں جس سے اس کے افکار کا حسن دوچند ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے''(۲۳)

سلمان صدیقی نے بھی اس ضمن میں اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے:

''شاعرؔ صدیقی کی شاعری کا بنیادی وصف سادگی اور سچ ہے کہ امنگوں بھری جوانی کے جذبات کے اظہار کی ابتدا کا ہو یا پھر''پانی کا ملک پتھر کے لوگ'' کے عنوان سے المیہ مشرقی پاکستان کے رونما ہونے والے دردناک واقعات کی منظوم دستاویز رقم کرنے کا ہو۔شاعرؔ صدیقی نے کسی مرحلے سچ کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔انھوں نے جو دیکھا جو محسوس کیا۔بغیر کسی پس وپیش کے اسی طرح رقم کر دیا''(۲۴)

شاعرؔ صدیقی نے انسان کی شیشہ صفتی پر ہمیشہ افسوس کیا ہے۔خاص طور پر وہ اپنے عہد کے سیاسی رہنماؤں پر شدید تنقید کرتے ہوئے دکھائی دے رہے ہیں۔جو اقتدار کا سہارا لے کر انسانوں کی مجبوری سے کھیلتے ہیں۔اُن کا کہنا ہے کہ یہ لوگ اپنے آپ کو ملک وقوم کا ہمدرد سمجھتے ہیں لیکن ان کی اصلیت ایسی نہیں بلکہ یہ مزدوروں کی لاشوں سے کفن بھی چھین لیتے ہیں۔شاعرؔ صدیقی نے ایسے درندہ صفت انسانوں کو مخاطب کر کے اپنی نظم''انتباہ''میں کچھ یوں لکھا ہے:

ملت و قوم کے ہمدرد وطن کے ہبر
کھیل لو کھیل لو انسان کی مجبوری سے

چند روز اور حکومت کا سہارا لے کر
رشک چنگیز بنو قوم کی مظلومی سے
شیش محلوں کی فضاؤں میں سنوارنے والو
چھین لو شوق سے مزدور کی لاشوں سے کفن
(۲۵)

ایک اور نظم ''جواب دو'' میں شاعر وطن کے رہبروں کو براہ راست مخاطب کرتے ہوئے اپنے جذبات کا اظہار کچھ یوں کرتے ہیں:

قصور کیا ہے ہمارا، ہمارے رہبرو!
ذرا بتاو تو کس جرم کی سزا ہے یہ
یہ ہم پہ ظلم و ستم کی نوازش پیہم
ہمارے بیش بہا خون کا صلہ ہے یہ
(۲۶)

شاعرؔ صدیقی کی نظمیں بلند فکر اور گہرے جذبات کی آئینہ دار ہیں۔ حق پرستی اُن کی فکر کے آئینے میں اُن کے دل کش اشعار کے توسط سے دیکھی جاسکتی ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ ہمارے معاشرے میں انصاف غریبوں سے ابھی دور ہے۔ مظلوموں اور بے بسوں پر ظلم کو روا رکھا جاتا ہے۔ نظم ''گریز'' سے چند اشعار ملاحظہ کیجئے:

اب بھی انصاف غریبوں سے جدا ہے اے دوست
اب بھی مظلوم پہ ہر ظلم روا ہے اے دوست
اب بھی آلام سے مغموم فضا ہے اے دوست
اب مظلوم نظر آتی ہے خلقت مجھ کو
میری محبوب نہ دے دعوت عشرت مجھ کو
(۲۷)

اس حوالے سے مزید مثالیں دیکھئے:

عصمتیں بھی وہی لوٹ کے بازار وہی
ہر سیاہ کار وستم گار کے کردار وہی
نالہ و آہو وہی، ظلم کے آثار وہی
ایسے ماحول میں جینا بھی ہے ذلت مجھ کو
میرے محبوب نہ دے دعوتِ عشرت مجھ کو

(۲۸)

شاعرؔ صدیقی کے نظمیہ کلام کا اگر بنظرِ عمیق جائزہ لیا جائے تو یہ بات سامنے آجائے گی کہ یہ سچائی اور حق پرستی ابتدا سے اُن کی شاعری کا محور رہی ہے۔ وہ کسی صورت میں سچائی کے دامن کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ انہوں نے جو دیکھا جیسے محسوس کیا اس کو بغیر کسی رکاوٹ کے اسی طرح رقم کیا۔ یہی وجہ ہے کہ دردمندی، رواداری اور انسان دوستی اُن کی شاعری کے بنیادی مآخذ رہے ہیں۔ سچائی سے وابستگی اُن کی سرشت میں دور اوائل سے موجود ہے ابتدائی دور سن ۱۹۵۰ کی ایک نظم ''مادرِ ہند'' میں وہ یوں لکھتے ہیں:

اُف وہ لٹتی ہوئی عصمت سرِ بازارِ غضب
زندگی موت کے پھندے میں گرفتارِ غضب
نالہ و آہ پہ تلوار کی جھنکار غضب
آہ! انسان کے بدلے ہوئے کردار غضب

بھول جائیں اسے اربابِ وطن ناممکن
نہ مٹائیں یہ درندوں کا چلن ناممکن

(۲۹)

شاعر علی شاعرؔ نے شاعرؔ صدیقی کی حقیقت پسندی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''میں نے بحیثیت پبلشرز اس سے پہلے بھی شاعرؔ صدیقی کی حقیقت

پسندانہ شاعری سے متاثر ہوکر کئی کتابیں شائع کی ہے اور یہ کتاب (سندر بن میں آگ) بھی اسی بات کا موجب بنی ہے کہ ایک اُداس شخص کی اُداسی کو دور کرنے میں میرا بھی کچھ حصہ ہو'' (۳۰)

سچائی نے ان کی شاعری میں اعلیٰ معیار کی ایک ایسی سطح قائم کی ہے جو قابل ستائش بھی ہے اور قابل رشک بھی۔ شاعرؔ صدیقی کا جذبہ کبھی بھی سرد نہیں پڑا ہے انہوں نے اپنی زندگی کے تجربے کی بنیاد پر انسانی رویوں اور معاشرتی بے حسی کی تصویر کشی جس انداز سے کی ہے عہد حاضر میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ سچ کہنا اُن کی فطرت میں شامل ہے وہ سچ کہے بنا نہیں رہ سکتے۔ زیب النساء زیبیؔ لکھتی ہیں:

''وہ عہد شناسی اور حقیقت نگاری کی قوت سے پوری طرح بہرہ ور ہیں۔'' (۳۱)

بہر کیف شاعرؔ صدیقی نے حق کی آواز کو عوام تک پہنچانے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ انھوں نے اُس حقیقت کو سامنے رکھنے کی کوشش کی ہے جو عام لوگوں کی فہم وفراست سے بالاتر ہے۔ وہ ایک باشعور شاعر اور نباض کی طرح قومی عارضے کی تشخیص کرنا بھی جانتے ہیں اور علاج بھی۔ وہ بحیثیت شاعر اپنے منصب پر پوری طرح اُتر چکے ہیں اور اُن کی توجہ قومی مفاد سے نہیں ہٹتی اور نہ وہ اس پر کسی بھی طور پر سمجھوتہ کرنے کے لیے تیار ہیں۔

رومانیت

رومانیت ہمارے ہاں ادبیات کا ایک ایسا مظہر رہا ہے جس کا پرتو تقریباً اُردو کے ہر جید شاعر اور ادیب کے ہاں دیکھا جاسکتا ہے۔ رومانیت میں جذبات اور تخیلات کا زور ہوتا ہے۔ عام اصطلاح میں رومانیت اس جذبے کا نام ہے جس میں شاعر یا ادیب اپنی عاشق مزاجی، جذبات انگیزی اور تخیل پرستی کا مظاہرہ کریں رومانیت کہلاتی ہے۔ رومانیت ایک وسیع المفہوم لفظ ہے اس کی اصطلاحی معنویت کو رد نہیں کیا جاسکتا۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر محمد خاں اشرف یوں تحریر کرتے ہیں:

''حقیقت یہ ہے کہ فن وادب اب تک جس مقام پر پہنچ چکے ہیں اور رومانیت کو فنون وادبیات میں جو مقام حاصل ہے اس کے پیش نظر یہ

ممکن نہیں کہ اس اصطلاح کو ترک یا نظر انداز کیا جا سکے۔'' (۳۲)

ڈھاکہ شہر میں شاعرؔ صدیقی کے قیام کا دورانیہ تقریباً بیس سالوں پر محیط ہے اسی دوران جو شاعری تخلیق ہوئی ہے اس میں رومانیت کا غلبہ قدرے زیادہ نظر آتا ہے۔ کیوں کہ وہاں شاعرؔ صدیقی ایک فلمی ماحول میں زندگی گزار رہے تھے اور ڈھاکا فلم انڈسٹری کے لیے گیت نگاری بھی کر رہے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے کلام پر رومانی اثرات اس زمانے میں زیادہ دیکھے جا سکتے ہیں۔ خاص کر شاعرؔ صدیقی کے گیت رومانوی شاعری کے ایک شاہکار ہے۔ یہ رومانیت محض گیتوں تک محدود نہیں بلکہ انھوں نے جتنی اصناف سخن پر قلم آزمائی کی ہے سب میں نمایاں ہے۔ رومانیت کا اظہار اُن کے ہاں بھرپور انداز میں ملتا ہے لیکن اس کے اظہار میں جذبے کی پاکیزگی اور تقدس کا خاص بھرم رکھا گیا ہے۔ ان کی ایک نظم سے بطور نمونہ چند اشعار دیکھیے:

تیری زلفیں ہیں کہ ساون کی گھٹا آوارہ
تیرا چہرہ ہے کہ کھلتے ہوئے نسرین وگلاب
تیری آنکھیں ہیں کہ دوجام شرابِ رنگیں
کچھ سمجھ میں نہیں آتا یہ حقیقت ہے کہ خواب
وہ حسیں خواب کہ تعبیر نہیں بن سکتی

چال ایسی کہ دھنک ڈول رہی ہو جیسے
شرم ایسی کہ بہاروں کا تبسم جیسے
ناز ایسا ہے کہ غنچوں کا بھی دل دھڑکائے
ایسی آواز کہ جھرنے کا ترنم جیسے
وہ سجل روپ کی تفسیر نہیں بن سکتی
تیری تصویر بناتا ہے مٹا دیتا ہوں
(۳۳)

ڈھاکا میں قیام کے دوران رومانوی جذبہ اُن کی شاعری کا خاص محور رہا ہے۔ ماحول کے

اثرات کو قبول کرتے ہوئے انہوں نے اس عنصر سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔اس سلسلے میں پروفیسر اظہر قادری یوں لکھتے ہیں:

''وہ فطری طور پر شاعر رومان ہیں۔لیکن بعض دوسرے رومانی شاعروں کی طرح وہ اخلاقی اقدار کو نذر انداز نہیں کرتے۔جب تک ڈھاکے میں رہے ان کی شاعری کا محور عشق اور رومان ہی رہا۔کراچی آ کر ان کے اشعار میں فکری عناصر کا اضافہ ہوگیا۔گزشتہ بیس پچیس سال سے انہوں نے جو غزلیں کہی اُن میں فکر وفن کا حسین امتزاج ملتا ہے۔حقائق حیات کی عکاسی بڑی خوبی سے کرتے ہیں بھرتی کے اشعار نہیں ہوتے۔ان کی اس خوبی نے ان کے اشعار کو چار چاند لگا دیے ہیں۔ان کے آخری دور کے عشقیہ اشعار تو خاص طور پر فکر ونظر کی بلندی اور پاکیزگی کا مظہر ہیں''(۳۴)

کلکتے کے فسادات سے نکل کر ڈھاکا میں انہیں ایک ایسا ماحول میسر آیا جو قدرے اطمینان بخش تھا۔ایک فلمی ماحول اور رنگین فضا میں رہنے کی وجہ سے اُن کی فکر میں یکسر تبدیلی واقع ہوئی جس سے اُن کی رومان پسندی میں اضافہ ہوا۔بقول انور فرہاد:

''ڈھاکا آنے کے بعد جب شاعر کو کلکتے کی نسبت زیادہ اطمینان بخش زندگی گزارنے کا موقع ملا اور جب لڑکپن گزرنے کے بعد اُنھوں نے نوجوانی کی دہلیز پر قدم رکھا تو ان کو اپنے اردگرد کے ماحول میں رومان پرور رنگینی نظر آئی جس کے نتیجے میں اُس دور کی شاعری میں رومان انگیزی کا اثر غالب نظر آتا ہے''(۳۵)

شاعرؔ صدیقی جذبات کے شاعر ہیں جس چیز نے شاعر کے کلام کو ممتاز بنا دیا ہے وہ جذبات کی گہرائی اور فکر کی بلندی ہے۔اُن کی رومان پسندی عمومی روایت سے مربوط ہے۔ابتدائی دور میں اُن کے کلام میں اُن کا تصور عشق بھی روایتی ہے۔وہ اپنے محبوب سے محبت کا اظہار کچھ اس طرح کرتے ہیں:

یہ جادو بھری نگاہیں تری
لبوں میں دبی یہ چنچل ہنسی
مہکی مہکی زلفوں کے سائے
تجھے جب بھی دیکھوں تو پیار آئے
میرے دل جگر کو قرار آئے
یہ لب ریشمی، یہ نین کنول
ترا روپ ہے سراپا غزل
عاشقی کا نغمہ ہے
یہ قاتل ادا، شرمیلا پن
کسی میں نہیں ہے ترا بانکپن
کبھی دلبری، کبھی بے رخی
کہو جان جاں خطا کیا ہوئی
ابھی تو محبت کا آغاز ہے (۳۶)

شاعرؔ صدیقی کی شاعری کئی ادوار پر محیط ہے لیکن رومانی جذبہ ہر دور میں اُن کی شاعری میں جلوہ گر ہے۔ بعض ادوار میں اگر چہ یہ جذبہ قدرے ماند تو پڑ گیا ہے لیکن یکسر ختم نہیں ہوا ہے کیوں کہ رومانیت اُن کی فطرت میں رچی بسی ہوئی ہے۔ وہ محبوب کے ریشمی لب گلاب جیسا چہرہ، نشیلی آنکھیں، مہکی مہکی زلفوں میں کبھی کبھار ضرور اسیر ہو جاتے ہیں اور اس کے مدح بیان کیے بے بغیر نہیں رہ سکتے۔

اتحاد المسلمین

اتحاد المسلمین ہر دور میں شعرا کے ہاں ایک اہم موضوع رہا ہے۔ اسی طرح اُردو ادب میں بھی تمام بڑے شعرا نے امت مسلمہ کے اتحاد کے متعلق اپنے گہرے جذبات واحساسات کا اظہار کیا ہے۔ حالؔی سے لے کر اقبالؔ تک اور قبالؔ سے عہد حاضرہ تک جتنے بھی شعرا گزرے ہیں تقریباً سب نے شاعری میں اس موضوع کو جگہ دی ہے۔ سب نے اپنی اپنی طرز نگارش کے موافق اُمت مسلمہ کو اتحاد

واتفاق کا درس دیا ہے۔

شاعرؔ صدیقی کے کلام کے مطالعہ سے ہمیں قومی یکجہتی اور قومی اتحاد کا جذبہ ابتدائی دور سے کارفرما نظر آتا ہے۔ اُنہوں نے قوم کو ہر غاصب اور جابر کے خلاف متحد ہونے کا درس دیا ہے۔ وہ مسلمانوں کو ماضی کی روایات کو پھر سے زندہ کرنے کی تعلیم دیتے ہیں تا کہ وہ اُخوت کے اس سبق کو پھر سے دہرائے۔ حال اور مستقبل کو ماضی سے جوڑے۔ سانحہ مشرقی پاکستان نے شاعرؔ صدیقی کے ہاں اس جذبے کو مزید جلا بخشی کیوں کہ اُنہوں نے مسلمان کو مسلمان کو خون بہاتے ہوئے دیکھا جس سے اُن کو بہت گہرا صدمہ پہنچا تھا۔ شاعرؔ نے اس ظلم اور بربریت کا سب سے بڑا سبب قومی نفاق سمجھا اور اس واقعے کو تاریخ عالم اسلام کا سب سے بڑا سانحہ قرار دیا کیوں کہ اس میں مسلمانوں کے خون کا دریا بہانے والے خود مسلمان ہی تھے۔ اُمت میں یکجہتی اُن کی خواہش ہے یہ اُن کی سرشت میں ابتدا ہی سے موجود ہے۔ وہ قومی انفراق سے دلبرداشتہ ہو جاتے ہیں۔ اُن کے انداز کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مسلمانوں کا شرازہ بکھرنے پر آنسوں بہاتے ہوئے دکھائے دے رہے ہیں۔ انہوں نے ہمیشہ انسانی قدروں کا خیال رکھا ہے۔ جو ایک طرح سے اُن کی انسانی دوستی کا بھی مظہر ہے۔ شاعرؔ صدیقی نے اس بات پر بھی دُکھ کا اظہار کیا ہے کہ اُمت میں ایسا کوئی رہنما نہ رہا جو ان میں اتحاد و اتفاق قائم کرنے کے لیے کوشش کریں۔

شاعرؔ صدیقی کے ہاں اس ضمن جو مثبت رویہ ملتا ہے وہ اُمید ہے۔ نا اُمیدی اُن کی فطرت میں نہیں ہے۔ وہ کبھی بھی۔ مایوس نہیں ہوئے ہیں۔ وہ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ مسلمانوں نے اُخوت کا جو سبق چودہ سو سال پہلے حاصل کیا تھا وہ رشتہ اب بھی قائم ہے۔ شاعرؔ صدیقی اپنی نظم جو اسلامی سربراہی کانفرنس کے موقع پر لاہور میں منعقد ہوا تھا ''تیسری دنیا کا سورج'' میں شرکت کرنے والے رہنماؤں کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

عالم اسلام کے اے کارواں خوش آمدید
راز تقدیر اُمم کے رازداں خوش آمدید
ملت اسلام کا شیرازہ تھا بکھرا ہوا
رنگ خوں کی ٹولیوں میں تھے مسلماں منتشر

اب سے چودہ سو برس پہلے لیا تھا جو سبق
دھیرے دھیرے یاد پھر آنے لگا باچشمِ تر
ہوگئیں اک بار پھر زندہ روایاتِ قدیم
مشرق و مغرب کے مسلم ایک مرکز پر ملے
سطوت اسلام کا پرچم ہوا ہے پرفشاں
مل گئے ہیں حال سے ماضی کے سارے سلسلے
(۳۷)

شاعرؔ صدیقی نے ایک اُمید ظاہر کی ہے کہ ملت اسلام کا جو شیرازہ بکھر ہوا پڑا تھا مسلمان رنگ وخوں میں بٹے ہوئے تھے۔لیکن آج اتفاق واتحاد کی اُن قدیم روایات نے ایک بار پھر کروٹ لی ہے۔ تمام اُمت مسلمہ کے قائدین پھر ایک فارم پر جمع ہوگئے ہیں۔شاعرؔ صدیقی نے مزید لکھا ہے:

پھر مسلمانوں نے دُہرایا اُخوت کا سبق
آج سے پھر ایک زریں دور کا آغاز ہے
ساری دنیا کی نگاہیں اس طرف مرکوز ہیں
آج پھر سارا زمانہ گوش بر آواز ہے
مشرق و مغرب سے آنے والے مہمانو!سلام
تم پہ اے ناموس ملت کے نگہبانو!سلام
تم کہ دین مصطفیٰ کے غازیان سرفروش
جن سے دریاؤں کے دل ڈوبے وہ طوفانو!سلام
(۳۸)

شاعرؔ صدیقی نے اس موقع پر نہایت خوشی کا اظہار کیا ہے کہ مشرق ومغرب سے اسلامی سربراہی کانفرنس میں اُمت مسلمہ کے قائدین عالم اسلام کی کامیابی کے لیے سرزمین پاکستان پر جمع ہوئے تھے۔ اور شاعرِ مشرق علامہ اقبال نے اُمت مسلمہ میں اتحاد اور یکدلی کا جو حسین خواب دیکھا تھا اس خواب کو تعبیر

ملنے کی گھڑی آ گئی ہے۔ اگر چہ سب کا تعلق دنیا کے مختلف خطوں سے تھا لیکن سب ایک رشتۂ اُخوت میں بندھے ہوئے تھے۔ جو رشتہ کلمہ توحید پر استوار تھا۔

شاعرؔ کہتا ہے کہ تیسری دنیا کا سورج پھر سے کروٹیں لے رہا ہے اور صبح نو کی آہٹیں ایک مرتبہ پھر سے تیزی پکڑ رہی ہے۔ اتحاد المسلمین اُن کی ایک روحانی خواہش ہے وہ چاہتے ہیں کہ یہ قوم پھر سے ایک منظّم اور ترقی یافتہ قوم بن جائے اور ماضی کی روایات سے اپنے مستقبل کا چراغ منور کریں۔

شاعرؔ صدیقی کو اس بات سے بھی صدمہ پہنچتا ہے کہ پاکستان جو کہ ایک نظریے کے تحت معرض وجود میں آیا تھا اس کے خاطر بے شمار لوگوں نے اپنے خون کا نذرانہ پیش کیا تھا جس کے لیے بہنوں اور بیٹیوں نے اپنی آبرو گنوائی تھی۔ لیکن پاکستان کی وہ متحدہ قومیت رنگ و نسل کی ٹولیوں میں بٹ گئی ہیں۔ شاعرؔ صدیقی اپنے رہنماؤں سے بصد خلوص سوال کرتے ہوئے کہتے ہیں:

بصد خلوص وادب ہم سوال کرتے ہیں
ہمارے رہنماؤ، ہمیں جواب تو دو
بتاؤ کیا اسی کارن بنا تھا پاکستان
کہ رنگ و نسل کی ٹولی میں لوگ بٹ جائیں
ہم اپنے اہل وطن بھائیوں کے ہاتھوں سے
زباں کے نام پر یوں بے زبان کٹ جائیں
بتاؤ کیا اسی کارن کئی برس پہلے
دیا تھا اپنا لہو بے شمار لوگوں نے
یہی وہ ملک ہے جس کے قیام کی خاطر
گنوائی آبرو اپنی جوان بہنوں نے
(۳۹)

شاعرؔ صدیقی سمجھتے ہیں کہ قوم کی انفراق اور اختلاف کی اصل وجہ دین سے دوری ہے۔ ہماری جمیعت جس چیز سے مستحکم ہے وہ دراصل دین مصطفوی ﷺ ہے۔ ہم اسلامی روایات کو بھول چکے ہیں یہی

وجہ ہے کہ ہمارے درمیان قومی، نسلی اور لسانی تعصب نے جنم لیا ہے۔ سندھی، بلوچی، پنجابی غرض ہر ایک کے چہرے پر صوبائیت کا غازہ ہے:

کوئی ہے سندھی بلوچی کوئی ہے پنجابی
ہر ایک چہرے پہ صوبائیت کا غازہ ہے
یہ مسئلہ نہیں بنگالی اور بہاری کا
ہمارے دوش پر اسلام کا جنازہ ہے
(۴۰)

شاعرؔ صدیقی کا کہنا ہے کہ اقبال کے اُس تصور کو ہم بھول چکے ہیں اور نہ یہ قائداعظم کے خواب کی وہ تعبیر ہے:

بتاؤ کیا یہی اقبال کا تصور تھا
یہی ہے قائد اعظم کے خواب کی تعبیر
خطا معاف نہیں یہ قیام بنگلہ دیش
ہر ایک گام نئے کربلا کی ہے تصویر
(۴۱)

الغرض شاعرؔ صدیقی نے قومی انفراق اور انتشار کا سب سے بڑا سبب یہ بتایا ہے کہ عالم اسلام اپنے ماضی کی روایات، اپنی مذہبی تعلیمات اور اپنے اسلاف کے کارناموں کو بھول چکے ہیں جس کا نتیجہ باہمی اختلاف کی صورت میں نکلا ہے۔ اور اُمت مسلمہ تنزل اور بربادی کا شکار ہو گیا ہے۔ شاعرؔ صدیقی کے ہاں موضوعات کا تنوع پایا جاتا ہے لیکن اُن کے بعض موضوعات اُن کے کلام کے مقصدی پہلوؤں کے مظہر ہیں جو اُن کی فکری زرخیزی کا ثبوت ہے۔ یہ مقصدیت اور فکری کی گہرائی محض نظم تک محدود نہیں بلکہ پوری شاعری پر اپنا اثر دکھاتا ہوا نظر آتا ہے۔ شاعر کے ہاں ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ وہ جس موضوع کو چھیڑتا ہے اس پر پوری طرح علمی گرفت بھی رکھتے ہیں۔ اقبال کی طرح ملت وقوم کے لیے دل میں وہ جو درد رکھتے ہیں اُس نے اُن کے کلام کو اہمیت کا حامل بنا دیا ہے۔

شہر آشوب

لفظ ''شہر آشوب'' فارسی زبان سے مآخذ ہے جو فتنہ،فساد،طوفان،سرکشی اورغدروغیرہ کے معنوں میں مستعمل ہیں۔اصطلاح میں شہر آشوب کسی ایسے فن پارے کو کہتے ہیں جس میں کسی شہر یا ملک کے انتشار،بدامنی،الغرض وہ تمام حادثات جس کے بُرے اثرات معاشرے کے ہر فرد اور ہر طبقے پر پڑتے ہیں شہر آشوب کہلاتا ہے۔بقول ڈاکٹر سلیم اختر:

> ''شہر آشوب ایسی نظم جس میں کسی ملک خطہ حکومت کی تباہی کے حوالے سے وہاں کی تہذیب وتمدن اور مجلسی زندگی کے ابتر ہونے اور اہل علم،اہل خرد،اہل قلم،اہل حرفہ،اہل ہنر کے برباد ہونے کا ماتم کیا گیا ہو''(۴۲)

اُردو میں شہر آشوب کے ابتدائی نمونے مسعود سعد سلمان کے کلام سے دریافت کیے گئے ہیں۔اس کے بعد امیر خسرو کے ہاں بھی رباعیات کی شکل میں شہر آشوب ملتے ہیں۔شہر آشوب فارسی شعرا کی ایجاد ہے۔لیکن اُردو کے بعض بیشتر شعرا نے شہر آشوب لکھے ہیں اس حوالے سے حاتم،سودا،اور نظیر اکبر آبادی کے نام قابل ذکر ہیں۔

شہر آشوب کے حوالے سے شاعرؔ صدیقی کی شاعری بھی اہمیت کی حامل ہے۔کیوں کہ اُن کا شعری سفر کئی ادوار پر مشتمل ہے۔ایک طرف اگر انہوں نے کلاسیکی روایت کو برقرار رکھا ہے دوسری طرف اُنھوں نے شہر کی بدحالی،معاشرتی پراگندگی کے خوب تذکرے بھی چھیڑے ہیں۔شاعرؔ صدیقی کی شاعری کا پہلا دور ہندو مسلم فسادات سے شروع ہوتا ہے۔پہلے دور کا کلام اگر چہ مقدار میں اتنا زیادہ نہیں ہے لیکن پھر بھی اُن کے اشعار میں اس دور کی خونچکاں اور دردناک حالات کی تصویریں دیکھی جاسکتی ہیں۔

زمانی انتشار کا آسیب اُن کے کلام پر ابتدا ہی سوار نظر آتا ہے۔کلکتہ سے ہجرت کے بعد یعنی ڈھاکا میں شاعرؔ صدیقی کی شاعری کا دوسرا اور طویل دور شروع ہوتا ہے۔یہ زمانہ شاعر کے لیے قدرے آسودگی اور فارغ البالی کا ثابت ہوا یہی وجہ ہے کہ اس دور کے تخلیق پاروں میں رومانیت کے عناصر نمایاں ہیں۔

شاعرؔ صدیقی کے تیسرے دور کی شاعری کا موضوع سانحہ مشرق پاکستان ہے۔یہ دور شاعرؔ

صدیقی کی شاعری کا مختصر ترین دور ہے۔ڈھاکا فال ہونا اُن کے لیے کسی بڑے سانحے سے کم نہ تھا۔ شاعرؔ صدیقی کا مختصر شعری مجموعہ ''پانی کا ملک پتھر کے لوگ'' اُس سانحہ کے نامساعدہ حالات اور وواقعات کی قلمی تصویر ہے جس کے تقریباً سارے اشعار شہر آشوب کے زمرے میں آتے ہیں۔

پاکستان آکر شاعرؔ صدیقی کی شاعری کا چوتھا اور آخری دور کا آغاز ہوتا ہے۔اس دور کی شاعری میں پاکستان کی سیاسی بدحالی ملک میں جان لیوا واقعات، تلخ وشیریں تجربات، نازک احساسات اور دیگر نامساعدہ حالات کا گہرا اثر اُن کی شاعری پر دیکھا جاسکتا ہے۔جن سے وہ دلبرداشتہ ہوگئے تھے۔اُنھوں نے جو کچھ محسوس کیا، دیکھا اُسے اسی طرح رقم کیا ہے۔شاعرؔ صدیقی ایک جگہ خود اپنی شاعری کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''اپنی شاعری کے بارے میں صرف اتنا کہنے کی جرأت کروں گا کہ برائے شعر گفتن میں کسی خاص ''ازم'' پر یقین نہیں رکھتا۔شاعری پوری زندگی کا احاطہ کرتی ہے اور اس میں رونما ہونے والے واقعات اور حالات کی عکاس ہوتی ہے۔زندگی کے مختلف ادوار میں جس نشیب و فراز سے گزرا ہوں اور اردگرد کے ماحول نے مجھے جس طرح متاثر کیا ہے وہ فطرت کے حسین مناظر ہو یا صنف نازک کا پیکر جمیل، زندگی کے تلخ تجربات ہو یا معاشرے میں پھیلے ہوئے ناہمواریاں اپنوں کی بے وفائیاں ہو، یا غیروں کی بے اعتنائیاں جس طرح میں نے محسوس کیا اسے سچائی کے ساتھ بیان کرنے کی کوشش کی ہے''(۴۳)

بھارت میں ہندو مسلم فسادات کے دوران کہی گئی نظم ''رات کٹ جائے گی'' سے چند اشعار پیش خدمت ہیں جس میں شاعر نے اس دوشیزہ کا ذکر کیا جو ہندو مسلم فسادات کے دوران سماج کی بھینٹ چڑھ گئی تھی:

مجھ کو معلوم ہے لوٹی ہے لٹیروں نے بزور
تیری رخسار کی سرخی ترے ہونٹوں کی شراب

چند حیوانوں نے مذہب کا سہارا لے کر
تجھ کو برباد کیا چھین لیا تیرا شباب
دیکھنا ہے کہ آئین شرافت کب تک
اور آزاد حکومت کی یہ حالت کب تک
(۴۴)

اُس دور کے خون آلودہ فسادات، آسیب زدہ چہرے، چشم گریاں کی حکایات بیان کرتے ہوئے شاعرؔ اپنی ایک اور نظم ''مادرِ ہند سے'' میں اظہار کرتے ہیں:

خشک ہونٹوں کی شکایاتِ گزشتہ توبہ
خون آلودہ فساداتِ گزشتہ توبہ
چشم گریاں کی حکایاتِ گزشتہ توبہ
اب بھی رقصاں ہے تخیل میں وہ خونی ساعت
چہرۂ زیست پہ چھائی ہوئی غم کی ظلمت
(۴۵)

شاعرؔ صدیقی حالات کی ہنگامہ خیزی سے دلبرداشتہ ہوکر ایسے ماحول میں وہ جینا اپنے لیے باعث ذلت اور رسوائی سے کم نہیں سمجھتے جس میں عصمتیں لوٹی جاتی ہیں۔

عصمتیں بھی ہیں وہی لوٹ کے بازار وہی
ہر سیاہ کار و ستم گار کے کردار وہی
نالہ و آہ وہی، ظلم کے آثار وہی
ایسے ماحول میں جینا بھی ہے ذلت مجھ کو
(۴۶)

نومبر ۱۹۷۰ء مشرقی پاکستان میں آنے والے طوفان جس کی وجہ معاشرے کا ہر خاص و عام جانی و مالی غرض ہر لحاظ سے تباہی سے دوچار ہو چکا تھا شاعرؔ نے ان قیامت خیز حالات کو بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

سینچتے تھے جو زمیں کو خون سے
نذرِ آغوش زمیں وہ ہوگئے
جن کی دم سے مسکراتی تھی حیات
موت کی وادی میں جا کر سو گئے
کیا بچا دل سوز منظر کے سوا
جابجا طوفاں شکن لاشوں کا ڈھیر
راستوں پر چلتی پھرتی زندہ لاش
جھاڑیوں میں بے کفن لاشوں کا ڈھیر
دھان کے کھیتوں کا جوبن لوٹ گیا
لٹ گئی سرسبز وادی کی بہار
رہ گئی تصویر بن کر رہ گئی
اَنگنت معصوم روحوں کی پکار
(۴۷)

سقوطِ مشرقی پاکستان کے موقع پر شاعرؔ صدیقی کے سامنے جتنے مناظر گزرے اور جو کچھ اُنہوں نے محسوس کیا، اُن خونی مناظر اور تصویر قیامت کو عیاں کرنے سے وہ خود کو قاصر سمجھتے ہیں۔ وہ خون میں لت پت تنِ معصوم، ماوں کے سامنے بچوں کا قتل عام، فضا میں گولیوں کی صدا اور خون میں تڑپتی ہوئی لاشوں کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

سرایک طرف خون میں لت پت تنِ معصوم
وہ سامنے ایک کا جگر گوشہ پڑا ہے
بندوق کسی ہاتھ میں، تلوار کسی میں
ہر موڑ پر ایک لشکرِ جلّاد کھڑا ہے
کتنے ہی مناظر ہیں میں کس کس کروں ذکر

جو دیکھ رہا ہوں وہ بیاں کر نہیں سکتا
احساس کے تنور میں جلتی ہے میری روح
محسوس جو کرتا ہوں عیاں کر نہیں سکتا
تصویرِ قیامت ہے یہی سولہ ستمبر
تاریخ نہ دُہرائے کبھی سولہ دسمبر
(۴۸)

شاعرؔ صدیقی کی نظمیں اُن کی زندگی کی افسردہ کہانی ہے جو ماضی کرب انگیزی سے معمور ہے۔ تقسیم ہند سے لے کر سقوط ڈھاکا اور کراچی کی گلیوں میں معصوموں کی خونریزیاں، بھتہ خوری، دہشت گردی، قتل وغارت گری سیاست دانوں کے ہاتھوں عوام الناس کے استحصال تک کے تمام تلخ واقعات کا احاطہ کرتی ہے۔

کراچی چوں کہ ایک بین الاقوامی اور صنعتی شہر تھا۔لیکن بدقسمتی سے ایک خدا اور ایک رسول کے ماننے والے ایک دوسرے کا خون بہانے لگے قتل بھتہ خوری، اغوا، سیاسی لوگوں کی مفاد پرستیاں، ان سب عوامل نے مل کر اس شہر کو وحشی درندوں کا جنگل بنادیا۔شاعر نے اپنی نظموں میں اِن حالات کی خوب عکاسی کی ہے۔اس کرب کو شاعرؔ صدیقی نے محسوس کیا اور اپنی شاعری میں شہر کو درپیش حالات کو پیش کیا۔امیر حسین چمن بیان کرتے ہیں:

''شاعرؔ کی زندگی ماضی میں جن حادثوں سے کھیلتی رہی ہے اسکے پس منظر سے کسی حد تک واقف ہونے کے ناطے ان قیامتوں کے پیش نظر یہ کہنا بے جانہ ہوگا کہ جب سمندر کی بھپری ہوئی موجوں سے دست گریباں ہونے کی صدیوں سے عادی سنگلاخ چٹانیں ان کے ظلم پیہم سے چیخ سکتی ہیں تو شاعرؔ کے سینے میں بھی بہر حال ایک دردمند اور حساس انسان کا دل دھڑکتا ہے جو ٹوٹ بھی سکتا ہے، بکھر بھی سکتا ہے، ٹوٹنے کا یہی عمل دھڑکن کی صداوں کو سنگینی احساس کے اس نشیب وفراز سے گزرتا ہے کہ

جس سفر کی منزل کا نام شاعری ہے'' (۴۹)

اس ضمن میں شاعرؔ صدیقی کی نظم ''شہرِ کوہ ندا'' کے چند اشعار دیکھئے جس میں شہرِ کراچی کی سنسان سڑکیں، ویران گلیاں اور فضا میں بارود کی بو محسوس کی جاسکتی ہے۔

اے میرے شہر
اے روشنی کے شہر
تجھ کو کسی کی نظر کھا گئی
تیری رواتوں پہ ہوتا تھا دن کا گماں
ہر طرف نغمہ رنگ کا کارواں
مثل آبِ رواں
زندگی ہر قدم پہ جواں
تیری ہر رہ گزر مثل کا ہکشاں
اب کہاں۔۔۔۔۔۔۔۔اب کہاں؟
آج کیوں پیار کی روشنی کے دیے
ٹمٹمانے لگے
اور اندھیروں کی عفرت کیوں
مسکرانے لگے
آج حدِ نظر تک ہے ویرانیاں
اور خاموشیاں
سڑکیں سنسان ہیں
تیرے بازار گلیوں میں
آوارہ کتوں کی پیہم صدا
خامشی کا جگر چیرتی

پیار کی خوشبوؤں سے بھری رہ گزر
آج بارود کی بو سے بوجھل ہیں
ہر طرف ہو کا عالم ہے اور کچھ نہیں
یہ سراسیمگی
اور یہ بے چارگی
روشنی کا یہ شہر حسیں
دیکھتے دیکھتے بن گیا
شہرِ کوہ ندا (۵۰)

شاعرؔ صدیقی کا کہنا ہے کہ جو لوگ شہر کے امن کو بربادی میں مگن ہیں اور قتل غارت گری کر رہے ہیں یہ دراصل ابلیس کے کارندے ہیں۔ جو ایک دوسرے کے خون بہانے سے دریغ نہیں کرتے۔ الغرض سارے شہر میں رقص ابلیس جاری ہے:

اک دھما کا ہوا
روشنی بجھ گئی
چاند سورج بھی گہنا گئے
تیرگی چھا گئی
رقص ابلیس جاری ہوا
شہر بغداد بھی شہر بیروت بھی
ناگاسا کی بنا، ہیر شیما بنا
اور افغان میں لاش ہابیل کی
دفن ہوتی رہی
ہاں مگر اب کے قابیل ہنستا رہا
مسکراتا رہا

آدمی کیا ہوا۔۔۔۔۔۔۔۔۔اک تماشا ہوا

دست ابلیس میں ابنِ آدم کھلونا بنا (۵۱)

شاعرؔ کا ماضی جبر مسلسل سے معمور ہے۔شہر آشوب اُن کی شاعری میں ایک اہم باب کی حیثیت رکھتا ہے۔اُنہوں نے اپنی آنکھوں سے جو دیکھا اسے محسوس کیا اور زندگی میں درپیش آنے والے تلخ واقعات کے ہر گوشے کو اپنی شعور آگہی کے ذریعے سے بے نقاب کیا ہے۔ان کی نظمیں ماضی اور حال کے سانحات سے لہولہان ہیں۔شہر آشوب کے موضوع پر شاعرؔ کی نظموں میں اس کے ذاتی احساسات، ذہنی، کیفیات اور بیان کے تجربات کی جھلک نمایاں ہے۔

یاد ماضی

شاعرؔ صدیقی کا حال ماضی سے جڑا ہوا ہے۔یہی وجہ ہے کہ اُن کا کلام بھی یاد ماضی کی تلخ وشیریں یادوں سے خالی نہیں ہے۔تنہائی کا یہ گہرا احساس اُن کے تمام صنف شاعری پر چھایا ہوا ہے۔وہ بھی عہد رفتہ کی یادوں میں مقید ہے۔جن سے وہ کسی صورت باہر نہیں نکل سکتے۔وہ تو بعض موقعوں پر یاد ماضی کو ایک عبث مشغلہ سمجھتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اُن کے پاس اگر کچھ بچا ہے تو وہ ماضی کی یادوں کا سہارا ہے۔

دو ہجرتوں کے الم ناک لمحوں کے علاوہ المیہ 1971ء کی کرب ناکی بھی اُن کے عہد رفتہ سے وابستہ ہے۔شاعر ایک نظم میں مشرقی پاکستان کے دلخراش حالات کا ذکر کچھ یوں کرتے ہیں:

کھینچ کر جس سے اک اک ملبوس
یوں نکالا گیا ہے ان کا جلوس
بربریت کی دیکھ کر یہ گھٹا
چرخ کو چاہیے تھا پھٹ پڑنا
بند جینے کی ساری راہیں تھیں
قتل گاہیں ہی قتل گاہیں تھیں
لائے جاتے تھے ایک اک کرکے
سارے افراد ایک اک گھر کے

یوں دکھاتے تھے ظلم کا جوہر
مارتے تھے اذیتیں دے کر
اک فسانہ حقیقتیں لاکھوں
ایک جاں اور اذیتیں لاکھوں
تن سے پہلے لہو نچوڑتے تھے
بعد میں ہڈیوں کو توڑتے تھے
آہ تاریخ کا یہ باب سیاہ
شرم سے اب نہ اُٹھ سکے گی نگاہ
(۵۲)

مندرجہ بالا اشعار میں شاعر نے اس دور کی کرب ناک صورتِ حال کی عکاسی بہت دل خراش انداز میں کی ہے۔ وہ قاری کو بھی اپنے ساتھ ماضی کے غم میں مبتلا کر دیتا ہے اور وہی حالات واقعات قاری کی نظروں کے سامنے رونما ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یادِ ماضی نے شاعر کے غم کو جلا بخشی ہے۔ اُن کے پاس چند یادوں کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ زندگی میں اذیتوں کے عادی ہو چکے ہیں۔ کلیم رحمانی اس حوالے سے کہتے ہیں:

''اُن کی بے قراری زندگی کی سنگلاخیوں کا خوگر ہونے لگی۔ اب اُن کی شاعری اُن لفظیات، امیجری، تراکیب اور پیچ وخم سے آشنا ہوئی جن سے میر، شاد عظیم آبادی، آصغر گونڈوی، جگر مرادآبادی، فراق، منیر نیازی قتیل شفائی، حمایت علی شاعر، جمیل مظہری، وفا براہی، اختر شیرانی مجاز لکھنوی، فیض احمد فیض، ناصر کاظمی، دیگر حضرات آشنا تھے۔ اس موڑ پر شاعر صدیقی کے لہجے میں درد، ہجر، فراق، اور یادِ ماضی، کی داستانیں آ گئیں ہیں۔ پھر بھی دل کشی باقی رہی۔'' (۵۳)

ماضی سے وابستہ شاعر کی کچھ یادیں ایسی بھی ہیں جن کو وہ کسی حال پر بھی کھونا نہیں چاہتے۔ جن کے سہارے وہ جیتے ہیں۔ جن سے شاعر نے اپنے ذہن کو تابندہ رکھا ہے:

ہاں مگر ذہن میں تابندہ رکھا ہے میں نے
روح افروز تری یاد کا ہر نقش حسین
یاد قصداً بھی کیا میں نے کہ اندیشہ تھا
وقت کی گرد میں یہ نقش نہ کھوجائے کہیں
اورآنکھوں میں بسارکھی ہے تصوری تری
وہ کنول نین وہ نینوں کا رسیلا کا جل
میری قسمت کی طرح میری شب غم کی طرح
وہ سیہ زلف وہ زلفوں کا گھنیرا بادل
یاد مٹ جائے گی احساس اگر مٹ جائے
یاداحساس کے پیکر سے جدا کچھ بھی نہیں
اور احساس کی قندیل اگر بجھ جائے
زندگی صرف اندھیروں کے سوا کچھ بھی نہیں
(۵۴)

شاعرؔ کا محبوب جب سرمگیں اور دل نشیں آنکھوں سے مسکراتا ہے تو اس کے ذہن میں ماضی کی تصویریں رقص کرنے لگتی ہیں:

اُٹھی میری طرف لجائی ہوئی
خواب آلودہ سرمگیں آنکھیں
نشہ آگئی ہے کائنات تمام
مسکراتی ہیں دل نشیں آنکھیں
ذہن میں پردۂ سیمیں کی طرح
کتنی تصویریں رقص کرتی ہیں
(۵۵)

نظم میں شاعر کے ماضی کی یادوں کو نہایت دل نشین انداز میں بیان کرتے ہوئے بے خواب ستاروں اور خاموش نظاروں سے اپنے ماضی کے بارے میں کچھ یوں پوچھتے ہیں:

پیتل کے درختوں کے سائے اور چاند کی وہ شیتل کرنیں
وہ چاندنی راتیں اب ہیں کہاں جب خواب نہ تھا ان آنکھوں میں
جب دل میں کروٹ لیتی تھیں جذبات کی بے پایاں لہریں
خاموش ہو کیوں اتنا تو کہو وہ جان محبت اب ہے کہاں
وہ غنچہ دہن وہ سیم بدن وہ منبع نکہت اب ہے کہاں
سپنوں کا مرے وہ تاج محل، وہ خواب کی جنت اب ہے کہاں
خاموش نظارو کچھ تو کہو
بے خواب ستارو کچھ تو کہو

(۵۶)

ماضی سے گہری وابستگی نے شاعر کے کلام کی رنگینوں میں اضافہ کیا ہے۔ جس سے سوز و گداز اور تڑپا دینے والی کیفیت نے اُن کے ہاں جنم لیا ہے۔ مندرجہ بالا مثالوں سے یہ واضح ہوتا ہے کہ شاعرؔ نے لطیف اور نرم لہجے سے ماضی کو یاد کیا ہے۔ اُن کے ہاں ایک ایسی کیفیت پیدا ہوگئی ہے جو قاری کو بھی اپنے غموں میں گھیر لیتا ہے۔ شاعرؔ نے اپنی نظموں میں نرم اور نازک انداز سے دل میں اُتر جانے والے مضامین کو بیان کیے ہیں۔

سیاسی شعور

شاعر کے افکار کی جڑیں اُس سماج سے پیوست ہوتی ہیں جس میں وہ گزر بسر کر رہا ہوتا ہے۔ کوئی شاعر گہرے احساس کے بنا اپنی شعر میں جان نہیں ڈال سکتا ہے۔ سماج سے جڑی شاعری میں زندہ رہنے کی صلاحیت موجود ہوتی ہے۔ اگر کوئی شاعر، ادیب ذات کے خول میں مقید رہے تو وہ کسی صورت شاعری میں عظمت پیدا کرنے کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ شاعرؔ کی نظموں میں بھی ایک جیتا جاگتا سیاسی شعور موجود ہے۔ جس کا اندازہ اُن کے ابتدائی اور آخری دور کے کلام سے لگایا جاسکتا ہے۔ خواجہ ریاض الدین عطشؔ لکھتے ہیں:

''جب ہم شاعرؔ صدیقی کی شاعری کا جائزہ لیتے ہیں اور پہلی نظر میں جو جہتیں سامنے آتی ہیں ان سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر نے اپنے ہی خیالاتِ زندگی کے تاثر اور وارداتِ قلبی کے ہاتھوں اپنے مشاہدات اور زندگی کے تجربوں کے دائرے میں رہتے ہوئے خارجی یا داخلی جذبوں کا احساس اور ادراک کیا ہے اور اسی راستے پر چل کر حیات وکائنات کی موہوم حدوں کو چھونے کی کوشش کی ہے۔ان کی شاعری روایتی ڈگر پر گامزن تو ہے لیکن پروگریسو سوچ اور رجحان رکھتی ہے اس لیے یہ پرانے اقدار اور نئی فکر کے سائے سائے چلتی ہے''(۵۷)

شاعر کے ہاں اپنے عہد کی بھرپور ترجمانی ملتی ہے۔گردوپیش میں رونما نے ہونے والے واقعات کو شاعر نے شاعری کے پہلو میں مقید کر دیے ہیں۔شاعر کی ایک نظم سے چند اشعار دیکھیے جن میں اُنھوں نے وطن کے سیاست دانوں سے قوم کے لہو کا حساب مانگا ہے جو اُن کی سیاسی آگہی پر دلالت کرتے ہیں:

خموش یوں ہو یہ موقع نہیں خموشی کا
ہمارے رہنماؤ ہمیں جواب تو دو
جو بہہ رہا ہے ابھی تک جو بہہ گیا اب تک
ہمارے محسنو !اس خون کا جواب تو دو
(۵۸)

نظم ''تیسری دنیا کا سورج'' جو شاعر نے 22 جون 1971 کے اسلامی سربراہی کانفرنس کے انعقاد پر لکھی تھی اس سے چند اشعار بطور نمونہ دیکھیے:

رومؔی و حالؔی کے دل کا سوز کام آہی گیا
منکشف ہونے لگے ہیں آج اسرارِ خود ی
شاعرؔ مشرق نے جو دیکھا تھا اک خوابِ حسیں
آگئی اس خواب کی تعبیر ملنے کی گھڑی

تیسری دنیا کا سورج لے رہا ہے کروٹیں
تیز تر ہونے لگیں ہیں صبحِ نو کی آہٹیں
(۵۹)

کلام کے فکری گوشوں میں سیاسی آگہی اُن کی ذہنی زرخیزی کا ثبوت بہم پہنچاتی۔ زندگی کے دیگر معاملات اور معمولات کے علاوہ شاعرؔ کی نظریں اپنے عہد کی سیاست پر بھی گہری رہی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے اپنے کلام میں زندگی کے ہر اُس پہلو کو اُجاگر کیا ہے جس کا تعلق سماج سے ہے۔

شاعرؔ صدیقی ایک ہنرمند نظم گو شاعر ہیں۔ دیگر شعری اصناف کی بہ نسبت اُن کی نظموں میں فکر و تخیل کی بلند پروازی زیادہ نمایاں ہے کیوں کہ یہ نظمیں اُس وقت کی تخلیق کردہ ہیں جب شاعرؔ کی سوچ اور فکر میں پختگی اور توانائی پوری آب و تاب کے ساتھ نمو پا رہی تھی۔ ان میں سانحہ مشرقی پاکستان کا دُکھ درد، غم و غصہ اور آہ و فغاں بھی موجود ہیں اور انسانی زندگی سے وابستگی رکھنے والے بہت سے مسائل کے تذکرے بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔ اُنہوں نے تلخ و شیریں تجربات، نازک احساسات، اور عمیق مشاہدات کو بے حد سلیقے سے پیش کر کے خود کو ایک ہنرمند اور کامل نظم گو شاعر ثابت کیا ہے۔ وہ اپنے مافی الضمیر کو جیسا چاہتے ہیں اسی طرح بیان کرنے پر کامل عبور رکھتے ہیں۔

شاعرؔ صدیقی کی نظموں میں فکر کی گہرائی کا اصل سبب یہ ہے کہ اُنہوں نے اپنی ذات کے دائرے سے نکل کر اُن مضامین کو زیرِ شعر لائے ہیں جن کی جڑیں کسی نہ کسی صورت میں سماج سے پیوست ہوتی ہیں۔ ان نظموں میں شاعر کی داخلی کیفیات ملت، سماج، سیاست، اتحاد، آمن اور آشتی نے جگہ لے لی ہے۔ وہ نئے نئے مضامین کو تلاش کرتے ہیں اور ہر ایک مضمون کو سو رنگ سے باندھنے کے ہنر سے بھی اچھی طرح واقف ہیں۔ وہ ہر موضوع پر علمی گرفت رکھتے ہیں۔ اس لیے ہر شعر میں اُن کی تخلیقی توانائی پوری طرح سے جلوہ تاب ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

حوالہ جات

۱۔شاعرؔ صدیقی،کلیات شاعرؔ صدیقی، رنگ ادب پبلی کیشنز، کراچی، اگست ۲۰۱۹ء، ص ۳۹۷

۲۔ایضاً، ص ۴۹۷

۳۔ رنگ ادب، شاعرؔ صدیقی نمبر، مشمولہ، انور فرہاد، رنگ ادب پبلی کیشنز، کراچی، جولائی تا ستمبر ۲۰۰۶، ص ۹۳

۴۔شاعرؔ صدیقی،کلیات شاعرؔ صدیقی، رنگ ادب پبلی کیشنز، کراچی، اگست ۲۰۱۹ء، ص ۴۶۵

۵۔ایضاً، ص ۴۵۶ ۶۔ایضاً، ص ۴۵۶ ۷۔ایضاً، ص ۴۶۰

۸۔ایضاً، ص ۴۶۱ ۹۔ایضاً، ص ۵۳ ۱۰۔ایضاً، ص ۳۹۷

۱۱۔ایضاً، ص ۴۱۶ ۱۲۔ایضاً، ص ۴۶۶ ۱۳۔ایضاً، ص ۳۹۶

۱۴۔شاعرؔ صدیقی، بجھتے سورج نے کہا، رنگ ادب پبلی کیشنز، کراچی، ۲۰۰۹ء ص ۱۷

۱۵۔رنگ ادب، شاعرؔ صدیقی نمبر، جولائی تا ستمبر ۲۰۰۶ء، رنگ ادب پبلی کیشنز، کراچی، ص ۱۰۸

۱۶۔شاعرؔ صدیقی،کلیات شاعرؔ صدیقی، رنگ ادب پبلی کیشنز، کراچی، اگست ۲۰۱۹، ص ۳۲۴

۱۷۔ایضاً، ص ۴۲۵ ۱۸۔ایضاً، ص ۴۲۵ ۱۹۔ایضاً، ص ۵۲۴

۲۰۔ایضاً، ص ۳۹۰ ۲۱۔ایضاً، ص ۳۹۱ ۲۲۔ایضاً، ص ۴۰۰

۲۳۔شبیر ناقدؔ، نقد فن، گرافکس میڈیا پبلی کیشنز، کراچی، ۲۰۱۱ء، ص ۲۰۱

۲۴۔شاعرؔ صدیقی، جگر لخت لخت، رنگ ادب پبلی کیشنز، کراچی، ص ۱۱۵

۲۵۔شاعرؔ صدیقی،کلیات شاعرؔ صدیقی، رنگ ادب پبلی کیشنز، کراچی، اگست ۲۰۱۹ء، ص ۴۱۹

۲۶۔ایضاً، ص ۴۲۴ ۲۷۔ایضاً، ص ۴۲۴

۲۸۔ایضاً، ص ۴۲۴ ۲۹۔ایضاً، ص ۳۹۷

۳۰۔شاعرؔ صدیقی، سندبن میں آگ، رنگ ادب پبلی کیشنز، کراچی، ۲۰۱۶ء ص ۳۴۲

۳۱۔شاعرؔ صدیقی، جگر لخت لخت، رنگ ادب پبلی کیشنز، کراچی، ص ۱۱۷

۳۲۔محمد خاں، اشرفؔ، ڈاکٹر، رومانیت، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۲۱ء، ص ۴۱
۳۳۔شاعرؔ صدیقی، کلیات شاعرؔ صدیقی، رنگ ادب پبلی کیشنز، کراچی، اگست ۲۰۱۹ء، ص ۵۱۲
۳۴۔شاعرؔ صدیقی، بجھتے سورج نے کہا، رنگ ادب پبلی کیشنز، کراچی، ص ۱۷
۳۵۔رنگ ادب، شاعرؔ صدیقی نمبر، مشمولہ، انور فرہاد، رنگ ادب پبلی کیشنز، کراچی، جولائی تا ستمبر ۲۰۰۶، ص ۳۸
۳۶۔شاعرؔ صدیقی، کلیات شاعرؔ صدیقی، رنگ ادب پبلی کیشنز، کراچی، اگست ۲۰۱۹ء، ص ۶۷۸
۳۷۔ایضاً، ص ۴۳۸ ۳۸۔ایضاً، ص ۴۳۸
۳۹۔ایضاً، ص ۴۴۰ ۴۰۔ایضاً، ص ۴۴۰
۴۱۔ایضاً، ص ۴۴۰
۴۲۔سلیم، اختر، ڈاکٹر، اُردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۱۳، ص ۱۷۶
۴۳۔شاعرؔ صدیقی، آنکھوں میں سمندر، پرنٹ میڈیا پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۲۰۰۴ء، ص ۳۱
۴۴۔شاعرؔ صدیقی، کلیات شاعرؔ صدیقی، رنگ ادب پبلی کیشنز، کراچی، اگست ۲۰۱۹ء، ص ۳۳
۴۵۔ایضاً، ص ۳۳۲ ۴۶۔ایضاً، ص ۴۲۴
۴۷۔ایضاً، ص ۴۳۵ ۴۸۔ایضاً، ص ۴۳۵
۴۹۔شاعرؔ صدیقی، آنکھوں میں سمندر، پرنٹ میڈیا پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۲۰۰۴ء، ص ۱۹
۵۰۔شاعرؔ صدیقی، کلیات شاعرؔ صدیقی، رنگ ادب پبلی کیشنز، کراچی، اگست ۲۰۱۹ء، ص ۴۱۶
۵۱۔ایضاً، ص ۴۱۷ ۵۲۔ایضاً، ص ۴۶۳
۵۳۔سہ ماہی، رنگ ادب، شاعرؔ صدیقی نمبر، جولائی تا ستمبر، ص ۸۷
۵۴۔شاعرؔ صدیقی۔کلیات شاعر صدیقی، رنگ ادب پبلی کیشنز کراچی، اگست ۲۰۱۹ء، ص ۴۷۷
۵۵۔ایضاً، ص، ۴۸۱ ۵۶۔ایضاً، ص ۴۸۹
۵۷۔ایضاً، ص ۱۰۷ ۵۸۔ایضاً، ص ۴۴۱
۵۹۔ایضاً، ص ۴۳۹

☆☆☆☆☆☆☆

شاعرؔ صدیقی کی متفرق شاعری

حمد

یہ شعری ادب کی وہ صنفِ سخن ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی تعریف بیان کی جائے۔عطاء الرحمٰن نوری اپنی کتاب ''اُردو اصناف ادب'' میں حمد کی تعریف کرتے ہوئے یوں لکھتے ہیں:

''حمد ایک عربی لفظ ہے جس کے معنی ''تعریف'' کے ہے۔اللہ کی تعریف میں کہی جانے والی نظم کو ''حمد'' کہتے ہیں''(۱)

اردو کی دیگر اصنافِ سخن میں حمد کو بہت اہمیت حاصل ہے۔حمد کا تعلق چوں کہ براہِ راست اللہ تعالیٰ کی ذاتِ گرامی سے ہے اس لیے اردو زبان کے شعرا نے حمد کو بڑی اہمیت دی ہے۔اردو کے دیگر شعرا کی طرح شاعرؔ صدیقی نے بھی حمدیہ شاعری کی ہے۔اُن کی حمدیہ شاعری اُن کی مذہبی عقیدت مندی اور جذبات کی عکاسی کرتی ہے۔اگر چہ اُن کا حمدیہ کلام اتنا زیادہ نہیں ہے تاہم جو بھی ہے وہ معیار کے لحاظ اپنی مثال آپ ہے۔شاعرؔ نے خالق حقیقی کی ثنا و توصیف بیان کرنے میں ہنرمندی کے ساتھ ساتھ اپنے عجز اور انکساری کا مظاہرہ بھی کیا ہے۔شاعرؔ کے حمدیہ اشعار خالق کائنات پر کامل یقین واعتماد کے مظہر ہیں۔اُنہوں نے بڑی عقیدت مندی کیساتھ اپنے رب کی تعریف وتوصیف بیان کی ہے۔اللہ سے بے پناہ محبت وعقیدت کی یہ جھلک محض نظموں تک محدود نہیں بلکہ دیگر اصنافِ سخن یعنی قطعہ، باعی، اور دوہے میں بھی پوری شان کے ساتھ نمایاں ہے۔حمد لکھنے کے لیے جو علمیت اور مطالعہ اسلام درکار ہوتا ہے شاعرؔ صدیقی اس سے خوب بہرور ہے۔

مناجات

کلیات کے آغاز میں مناجات شامل ہیں جس میں شاعرؔ نے اللہ سے دل کی وسعت اور فکر کی گہرائی مانگنے کے ساتھ ایسی بینائی مانگنے کی دُعا کی ہے جو اللہ کے جلوؤں کو دیکھنے کی صلاحیت رکھتی ہو:

دل میں وسعت دے میرے فکر کو گہرائی دے

ساتھ جو دے تیرے جلووں کا وہ بینائی دے
میری تقدیر میں رسوائی اگر لکھ دی ہے
پھر مجھے اپنی محبت میں ہی رسوائی دے
یورشِ غم سے ہوا ہے میرا جینا دوبھر
دے مجھے حوصلۂ صبر و شکیبائی دے
میں بدلتے ہوئے حالات کے تیور دیکھو
آگہی دے مجھے ایسی مجھے دانائی دے
(۲)

اس مناجات کے آخر میں شاعر نے اللہ سے فریاد کرتے ہوئے کہا ہے کہ انسانیت کی توہین مجھ پر گراں ہوگئی ہے۔ مجھے جرأت گویائی دے تاکہ میں اس کے خلاف آواز اُٹھا سکوں کیوں کہ بحیثیت شاعر حق کی تلقین کرنا میرا فریضہ ہے۔ شاعرؔ نے اللہ سے اپنے اشعار میں احساس کی سچائی مانگتے ہوئے کچھ یوں لکھا ہے:

آدمیت کی میں توہین کہاں تک دیکھوں
یا زباں چھین لے یا جرأتِ گویائی دے
میں کہ شاعر ہوں میرا کام ہے حق کی تلقین
میرے اشعار میں احساس کی سچائی دے
(۳)

عظمت الٰہی

حمد کا اصل وصف یہ ہے کہ اس میں شاعر خود کو کمزور، بے بس اور لاچار دکھاتا ہے جبکہ اللہ کی عظمت، شان وشوکت اور بڑائی کا اعتراف کرتا ہے۔ شاعرؔ صدیقی کی حمدیہ شاعری میں بھی یہ رنگ نمایاں دکھائی دیتا ہے۔ شاعرؔ بیان کرتے ہیں کہ اے اللہ تیری ثنا کو بیان کرنا ہماری بس کی بات نہیں ہے اور نہ یہ حق ہم پوری طور پر ادا کر سکتے ہیں۔ کیوں کہ تو واحد لاشریک اور بے مثال ذات ہے:

تیری ثنا کا حق بھی کیا ادا کرے
واحد ہے ، شریک ہے، تو بے مثال ہے
قائل ہوا ہوں عشق کا دریا دلی کا میں
دل میرا آج بحرِ غمِ لازوال ہے
(۴)

شاعرؔ کا عقیدہ ہے کہ انسان کائنات میں سب سے افضل ہے۔کیوں کہ انسان ذات باری تعالیٰ کی ذات کا عکس جمال ہے:

افضل ہے کائنات میں شاید اسی لیے
انسان تیری ذات کا عکس جمال ہے
(۵)

اللہ تعالی کی ذات کے علاوہ کائنات میں تمام مخلوقات کے لیے کوئی اور سہارا نہیں ہے۔اگر مشکلات کو حل کرنے والا ،عزت، ذلت اور نور ہدایت سے بہرہ ور کرنے والی صرف اللہ ہی کی ذات گرامی ہے تو پھر انسان کس بات پر غرور کرتا ہے۔شاعرؔ نے ایک نظم میں کہا ہے کہ اے اللہ جنہیں تو نے طاقت دی ہے انھیں نور ہدایت سے بھی بہرہ ور فرما:

تیرا در چھوڑ کر جائیں کہاں مشکل کشا تو ہے
نہیں جس کا کوئی دنیا میں اُس کا آسرا تو ہے
جسے چاہے تو عزت دے جسے چاہے تو ذلت دے
مگر طاقت جنہیں دی ہے اُنہیں نورِ ہدایت دے
لیے پھرتے ہیں سر میں غرور و کبر کا سودا
عجب کیا ہے کہ کر بیٹھیں کبھی دعویٰ خدائی کا
انھیں توفیق دے یارب کہ سمجھیں کبریا تو ہے
(۶)

شاعرؔ صدیقی نے شعر میں خیال وفکر کو ترجیح دی ہے۔اُن کے حمدیہ اشعار اُن کے صوفیانہ طرز فکر ،مذہبی عقیدت مندی اور عشق الٰہی کے عکاس ہے۔انہوں نے حمد میں مختلف موضوعات کو بروئے کار لاتے ہوئے باری تعالیٰ کو عبادت اور مدد کی واحد ہستی گردانا ہے۔اللہ کی شان کریمی اور اور رحیمی پر کامل یقین رکھتے ہوئے بارگاہ الٰہی میں اپنے گناہوں کی بخشش کی استدعا کی ہے۔ایک حمد میں شاعرؔ صدیقی قوم کی انفرادی اور اجتماعی حالت زار کو بہتر اور خوشگوار بنانے کے لیے یوں بارگاہِ حق تعالیٰ میں دعا مانگتے ہیں:

کرم کا وقت ہے یارب غریبوں کا خدا تو ہے
ترا در چھوڑ کر جائیں کہاں مشکل کشا تو ہے
(۷)

نعت

نعت عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی صفت وثنا اور تعریف وتوصیف کے ہیں۔اصطلاحاً نعت اس نظم کو کہا جاتا ہے جس میں ذات حضور نبی کریم ﷺ کی صفات بیان کی جائیں۔نعت میں آپ ﷺ کی حیات مبارکہ،اخلاق حسنہ،سیرت وکردار کے تذکرے ہوتے ہیں۔ماہرینِ ادب نے اپنے اپنے انداز کے موافق نعت کی تعریف کی ہے۔رفیع الدین ہاشمی کے بقول:

''نعت وہ صنف نظم ہے جس میں رسول پاک ﷺ کی ذات،صفات، اخلاق اور شخصی حالات کا بیان ہوتا ہے اور آپ ﷺ کی ہمہ پہلو مدح کی جاتی ہے''(۸)

نعت کی تعریف کرتے ہوئے شہزاد احمد کچھ یوں لکھتے ہیں:

''نعت (ن ع ت) عربی زبان کا معروف سہ حرفی لفظ ہے۔جس کی لغوی معنی تعریف وتوصیف بیان کرنے کے ہیں۔نعت عربی کا اسم اور مؤنث ہے۔عرف عام منظوم کلام کے علاوہ نثر میں بھی مستعمل ہے۔ یعنی لفظ نعت کا اطلاق نظم ونثر دونوں میں مروج ہے''(۹)

شاعرؔ صدیقی اگر دیگر اصناف سخن کی طرح نعت کی طرف زیادہ توجہ دیتے تو یقیناً وہ اُردو نعت

کے ممتاز شعرا کے صف میں جگہ پا سکتے تھے کیوں کہ اُنھوں نے جس صنف سخن پر بھی طبع آزمائی کی ہے اُس میں اپنی ہنرمندی کا لوہا منوایا ہے۔ اُن کی نعتیہ شاعری کے محدود سرمایے نے اتنی شہرت حاصل کی ہے کہ بعض نعتیں آج تک محافل نعت کی تزئین بنی ہوئی ہیں اور بڑی عقیدت سے پڑھی اور سنائی جاتی ہیں۔ اس حوالے سے شاعر علی شاعرؔ یوں رقم طراز ہیں:

"شاعرؔ صدیقی نے جس جس صنف ادب میں اپنے تخلیقی جوہر دکھائے ہیں، اُس اُس صنفِ سخن کو ناقدین نے انہیں اپنانے کا مشورہ ضرور دیا ہے"(۱۰)

حبِ رسول ﷺ

ترقی پسند شعرا اور ادیبوں کو ہمیشہ اس الزام کے مرتکب سمجھے گئے ہیں کہ وہ مذہب سے دور ہیں لیکن شاعرؔ صدیقی اس سے مستثنیٰ ہے کیوں کہ ایک ترقی پسند ذہن رکھنے کے باجود وہ نعت کی سعادت حاصل کیے بغیر نہیں رہ سکے جو حضور ﷺ سے اُن کی بے لوث عشق و محبت کی واضح ثبوت بہم پہنچاتی ہے۔ احمد رشدی کی آواز میں اُن کی مشہور زمانہ نعت سے چند اشعار دیکھئے جو نعتیہ شاعری کے میدان میں اُن کی پہچان بنی:

مدینے والے پر میر اسلام کہہ دینا
تڑپ رہا ہے تمھارا غلام کہہ دینا
مدینے سے گزر جب ہو صبا صلِّ علیٰ پڑھ کر
ادب سے روضہ اقدس کو اُن کے چومنا بڑھ کر
میں خادم ہوں شہِ دیں کا مجھے دنیا سے کیا مطلب
اُن ہی کے جلوے رہتے ہیں میری آنکھوں میں روز شب
(۱۱)

شاعرؔ صدیقی جب عمرے پر گئے تو اُنھوں وہ گلیاں اپنی جاگتی آنکھوں سے دیکھی جنہوں نے حضور کے قدم مبارک چھومے تھے اُنھوں نے وہ زمین دیکھی جہاں شب و روز حضور ﷺ کے فیض سے رحمتیں برستی ہیں۔ شاعرؔ کے کلام میں حضور کے ساتھ عشق و محبت کا رنگ بہت گہرا نظر آتا ہے:

نظر میں شہر مدینہ بسا کے لایا ہوں
میں آج نور کے سانچے میں ڈھل کے آیا ہوں

میرا نصیب کہ مکہ بھی اور مدینہ بھی
میں اپنی جاگتی آنکھوں سے دیکھ آیا ہوں
وہ سرزمیں کہ جہاں رحمتیں برستی ہیں
گل مراد سے دامن کو بھر کے لایا ہوں
جمال روضۂ اقدس کی بات کیا کیجئے
سرور و کیف کی دنیا سمیٹ لایا ہوں
بتاؤ کیا تمھیں شاعرؔ حضور سے اپنے
جو بات دل میں تھی وہ بات کہہ کے آیا ہوں
(۱۲)

شاعرؔ صدیقی کے نعتیہ اشعار میں حضور سے اُن کی بے پناہ پیار ٹھاٹھیں مارتا ہوا دیکھا جاسکتا ہے۔ گلزار مدینہ اُن کے لیے اس نسبت سے دنیا و مافیہا سے افضل و بہتر ہے کہ وہاں روضۂ اقدس واقع ہے۔ روئے زمین کے اُس خطے کو اُنھوں نے جنت پر بھی فوقیت دی ہے۔ وہ جب روضہ اقدس کو دیکھتے ہیں تو ایک جشن چراغاں ہوتا ہے اور پلکوں پر دیے جلنے لگتے ہیں:

آنکھوں کے مقابل ہوتی ہے جب روضہ اقدس کی جالی
ایک جشن چراغاں ہوتا ہے پلکوں پہ دیے جب جلتے ہیں
گلزار مدینے کو شاعر ہم جنت ارضی کیوں نہ کہیں
دن رات برستی ہے رحمت خوش رنگ نظارے پلتے ہیں
(۱۳)

شاعرؔ حضور ﷺ کی فیض و عظمت بیان کرتے ہوئے مزید لکھتے ہیں:

جس پہ لطف کرم سید والا ہو جائے
زندگی اُس کی حریف غم دنیا ہو جائے
دستگیری جو کریں آپ ﷺ ہمارے آقاؐ

بحرِ ظلمات کا منجدھار کنارا ہو جائے
میرا ویرانہ دل شہر مدینہ ہوجا ئے
آپ ﷺ اگر سامنے ہوں آپؐ کے جلووں کی قسم
میں نہ دیکھوں درِجنت بھی اگر وا جا ئے
میرے آقاؐ کی اگر مجھ پہ نظر ہوں شاعرؔ
رشک خورشید مقدر کا ستارا ہو جائے
(۱۴)

شاعرؔ صدیقی کی نعتیہ شاعری میں خیال بندی کے ساتھ معنی آفرینی کا عنصر بھی غالب نظر آتا ہے۔اُنھوں نے دوسرے نعت گوشعرا کی طرح حضور سے اپنی داخلی جذبات کو کافی ہنرمندی کے ساتھ قلم بند کرنے کی ایک کامیاب کوشش کی ہے۔شاعرؔ کی نعت کے جذباتی پہلو میں حضور ﷺ سے اپنے والہانہ عشق ومحبت کی طرف بھرپور توجہ مرکوز کی ہے۔سردار دوجہاں سے اس والہانہ عقیدت کے ساتھ ساتھ انھوں نے روضہ اقدس کے دیدار کا اشتیاق بھی ظاہر کیا ہے۔ایک شعر میں وہ اس والہانہ عقیدت کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں:

مدینے جب گیا تھا میں عجب سی دل کی حالت تھی
مِرے آقا کے روضے پہ بکھر جانے کو جی چاہا
(۱۵)

الغرض پیغمبر اسلام ﷺ اور سرور کائنات کا پیار اور بے لوث محبت اُن کی مذہبی عقیدت مندی اور دین اسلام سے گہری وابستگی کا مظہر ہے۔

فضائل رسول ﷺ

شاعرؔ حضور ﷺ کی ذاتِ رحمت سے بے پناہ محبت رکھتے ہیں اوراُن کی آنکھیں شہر انوار (مدینہ) کو دیکھنے کے لیے ہرلحہ ترستی ہیں۔وہ اپنی عقیدت کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ آپ ﷺ کی ذات چراغ ضوفشاں ہے جس کی آمد کی وجہ سے کون ومکاں روشن ہوگئے اور کائنات کی تخلیق ہوگئی:

آپ ﷺ سے روشن ہوئے کون ومکاں
''آپ ﷺ کی ہستی چراغِ ضوفشاں''
آپ ﷺ ہی کے فیض سے جاری ہوا
رحمتوں کا ایک بحرِ بیکراں
آپ ﷺ ہی رحمت اللعالمین
دو جہاں میں آپ کا ثانی نہیں
(۱۶)

شاعرِ صدیقی کا کہنا ہے کہ حضور ﷺ کی ذات مبارک رحمتوں کا ایک ایسا دریا ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں، حضور ﷺ کا کائنات میں کوئی ثانی نہیں کیوں کہ وہ دونوں جہانوں کے لیے رحمت وشفقت بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ آپ ﷺ کی رحمت وشفقت کی ضوفشانی نے دنیا کے ہر کونے کو منور کیا ہے۔

خصائل رسول ﷺ

شاعرِ نے حضور ﷺ کی خصوصیات بہت احسن طریقے سے بیان کی ہیں۔ وہ حضور ﷺ کی خوبیاں بیان کرتے ہوئے کچھ یوں اظہار کرتے ہیں:

آپ کا ہر قول فرمانِ خدا
آپ کی باتیں گلستاں بوستاں
آپ ﷺ کا ادنیٰ سا یہ اعجاز ہے
بول اُٹھے سنگ ریزے بے زباں
معجزہ معراج کی شب یہ ہوا
ہوگئے ساکت زمیں و آسماں
(۱۷)

شاعر نے آپ ﷺ کو براہ راست مخاطب کرتے ہوئے معجزات کا تذکرہ کیا ہے کہ آپ کا ادنی سا اعجاز یہ ہے کہ بے زباں سنگ ریزوں کی زبان پر بھی کلمہ توحید جاری ہوگیا ہے۔ اور جب آپ شب معراج پر

تشریف لے جارہے تھے تو یہ اتنا عظیم معجزہ تھا کہ زمین و آسماں یعنی تمام کائنات پر سکتہ طاری ہوگیا تھا۔

دوہے

اُردو میں دوہا دیگر اصناف کی طرح ہندی زبان سے ماخوذ ہے جو بنیادی طور ہندی صنف ہے۔ آزادی کے بعد دوہے نے بہت ترقی کی۔ اردو ادب میں الیاس عشقی، جمیل الدین عالی، ڈاکٹر طاہر سعید ہارون، تاج قائم خانی، ڈاکٹر جمیل، محسنِ اعظم، محسن ملیح آبادی اور شاعرؔ صدیقی جیسے شعرا صنف دوہے کے حوالے سے قابل ذکر ہیں۔ شاعرؔ صدیقی کے دوہے اگرچہ تعداد میں زیادہ نہیں ہیں لیکن اس کے باوجود یہ فن اور فکر کے اعتبار سے اپنی مثال آپ ہیں۔ شاعرؔ صدیقی کے دوہے رومانی، تہذیبی، معاشرتی اور اخلاقی مضامین پر مشتمل ہیں۔

رومانیت

شاعرؔ صدیقی بنیادی طور پر ایک رومانوی شاعر ہے۔ اگر رومانوی تناظر میں اُن کی شاعری کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا جائے تو ان کی کہی ہوئی غزلوں، نظموں، گیتوں، دوہوں، قطعات اور رباعیات میں بھی یہ جذبہ پورے شباب کے ساتھ نظر آتا ہے۔ ان کے بیشتر اشعار میں رومانیت کی ٹھان دیکھی جاسکتی ہے۔ انہوں نے اپنے جذبات کا بے باکی سے اظہار کیا ہے۔ خواہ وہ داخلی ہو یا خارجی دونوں حوالوں سے انہوں نے دل کی بات کو شعر کے پردے میں ڈال کر حق گوئی اور بے باکی کا ثبوت بہم پہنچائی ہے۔ ان کے ہاں رومانیت کے غالب رجحان کے حوالے سے شاعرؔ کے رومانوی رویے کی دو وجوہات سامنے آتی ہیں ایک تو یہ کہ شاعرؔ صدیقی براہ راست رومانوی اور ترقی پسند تحریک سے متاثر نظر آتے ہیں کیوں کہ ان کے اکثر یت اشعار ایسے ہیں جن کے مطالعے سے لگتا ہے کہ شاعرؔ صدیقی ترقی پسند تحریک کے زیر اثر میدان میں اُترنے والے شخص ہے۔ دوسری بات ان کا فلمی ماحول سے وابستگی کی ہے جس کی وجہ سے ان کے رمانوی طرز فکر کو نشو ونما حاصل ہوئی ہے۔ اور اُن کی پوری شاعری میں ایک رومانوی فضا قائم ہوئی ہے۔ یہ وہ دور تھا جب ڈھاکا فلم انڈسٹری میں روایتی اور رمانوی فلمیں بنتی تھیں۔ عارف منصور لکھتے ہیں:

''وہ اس ماحول سے کیسے فرار حاصل کرسکتا تھا۔ نتیجتاً اس کی شاعری کی

پوری فضا رومانوی انداز فکر میں ڈوبی ہوئی ہے۔لیکن خصوصیت یہ ہے
کہ اُن کے استفسار میں فلمی فضا بہت کم ہے،(۱۸)

شاعرؔ صدیقی نے اپنے دوہے میں رومانوی مضامین کو بہت خوب صورتی سے نظم کیا ہے۔جب وہ محبوب کی خوبصورتی کی منظر کشی کرتے ہیں تو کمال کرتے ہیں۔شاعرؔ صدیقی کو محبوب کے رسیلے ہونٹ اور شرابی نین سپنوں میں یاد آتے ہیں جو اس کا چین اور سکھ حرام کرتے ہیں۔محبوب کی متوالی آنکھوں کو جب وہ دیکھتا ہے تو وہ جیون کے تمام دکھ بھول جاتے ہیں۔اس کے سانولی رنگت اور سوہنا مکھڑے سے ان پر قیامت بپا ہوتی ہے۔اس ضمن میں شاعر صدیقی کے دوہے قابل دید ہے:

سپنوں میں آ آ کے میرے چھین گئے سکھ چین
اُف وہ رسیلے ہونٹ کسی کے اُف وہ شرابی نین
(۱۹)

متوالے نینوں میں کجرا اور جوڑے میں پھول
دیکھ کے تم کو دکھ جیون کے آج گئے ہم بھول
(۲۰)

بان چلایا کس نے من پر یہ نہ پوچھو ہائے
سانولی رنگت،سوہنا مکھڑا،دل پہ قیامت ڈھائے
(۲۱)

اپنی رومانوی فکر اور جذبے کی بنا پر وہ اپنے محبوب کے حسن کی تعریف بہت دل کش اور شگفتہ طریقے سے کرتے ہیں۔محبوب کی مدماتی آنکھوں پر کاجل کی لکیر اُن کے دل پر کٹار کی طرح لگتی ہے:

ایک تو یہ مدماتی آنکھیاں پھر کجرے کی دھار
جب جب تجھ کو دیکھوں میرے من میں لگے کٹار
(۲۲)

سجنی اب تک یاد ہیں مجھ کو تیرے میٹھے بول
من کی گرہ پھر کھول مرے کانوں میں پھر رس گھول
(۲۳)

کلام میں رومانوی فضا قائم کرنے کی وجہ سے ان کے ہاں ایسی دلکشی پیدا ہوگئی ہے کہ قاری شعر کو ایک دفعہ پڑھ لیں تو بار بار پڑھنے کے لیے جی مائل ہو جاتا ہے کیوں کہ ان کے ہاں جو جذبہ پروان چڑھا ہے وہ انسانی روح کو چولے لینے والا ہے۔

اخلاقیات

ہر شاعر کا کردار اور شخصیت اس کی شاعری کے آئینے میں جھلکتی نظر آتی ہے۔ شاعرؔ صدیقی ایک با اخلاق اور صاحب کردار شخصیت کے مالک ہیں۔ شاعرؔ کے کلام میں جو اخلاقی درس ملتا ہے وہ اُن کی شخصیت کے مثبت پہلوؤں کی نمائندگی کرتا ہے۔ ان کی شخصیت کی تمام خوبیاں ان کی شاعری میں جلوہ گر ہیں۔ اپنے داخلی جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے وہ اخلاقی اقدار کو نظر انداز کرنے کا قائل نہیں ہے۔ کیوں کہ وہ معاشرے میں خیر وفلاح کی فروغ کے خواہاں ہیں۔ ان کے جذبوں میں ایک نفاست پائی جاتی ہے۔ جذبات کی اس طہارت وشرافت نفسی نے ان کی شاعری کو ایک اعلیٰ درجے پر فائز کی ہے۔ وہ بھٹکتے ہوئے انسانیت کی اخلاقی اصلاح اور راہ راست پر لانے کی آرزو رکھتے ہیں۔ شاعرؔ صدیقی نے اپنے کلام کو ابتذال اور سوقیانہ فن سے بچانے کی بھرپور کوشش کی ہے جس میں وہ کامیاب بھی نظر آتے ہیں۔ یوں تو انہوں نے غزل، نظم، گیت غرض ہر جگہ اپنے اخلاقی معیار کا خیال رکھا ہے۔ اخلاقی تناظر میں اُن کے دوہے قابل دید ہیں جس سے شاعر کی اخلاقی رفعت کا اندازہ بخوبی لگایا سکتا ہے۔

وہ اپنے دوہے میں انسان کو درس دیتے ہوئے اظہار خیال کرتے ہیں کہ انسان کو اپنی خودی کو پہچاننے اور اپنے خاکی جسم پر فخر وغرور نہیں کرنی چاہیے۔ شاعرؔ نے انسان کو اس کی بے بسی کا احساس دلایا ہے کہ تیرے بس میں کچھ بھی نہیں ہے۔ کوئی اگر اس نظریے کے حامل ہے تو یہ اس کی بے وقوفی ہے۔ کوئی اگر کانٹے بوئے گا تو اس کے راستے میں کانٹے ہی آئیں گے۔ یہاں صرف نیکی کے لیے دوام ہے۔ باقی سب چیزیں تن، من اور سنسار مٹی میں ملنے والی ہیں:

ماٹی آگ ہوا اور پانی کا سنگم انسان
کاہے اتنا مان کرے ہے اپنے کو پہچان
(۲۴)

تن ہے ماٹی ، من ہے ماٹی ماٹی ہے سنسار
ماٹی میں سب مل جائے گا کس سے کرے ہے پیار
(۲۵)

سب کچھ تیرے بس میں ہیں سن یہ ہے تیری بھول
پھول کہاں سے پائے گا تو بوئے اگر ببول
(۲۶)

سچائی ایک اخلاقی خوبی ہے جس کی تلقین کرتے ہوئے شاعر کہتے ہیں کہ سچ بات کہنا اور سچائی کا ساتھ دینا زہر کا پیالہ پینے کے مترادف ہے۔لیکن اس سچائی سے گھبرانا نہیں ہے ہر حال میں اس کی پاسداری رکھنی ہے۔اگر چہ یہ دنیا دکھ اور درد کی نگری ہے اس کا سمجھانا کٹھن کام ہے۔

اس دھرتی کی ریت یہی ہے پھر کیسا گھبرانا
سچ کے زہر کا پیالہ پینا اور امر ہو جانا
(۲۷)

گھائل من کا پاگل پنچھی پگ پگ ٹھوکر کھائے
یہ نگری ہے دکھ کی نگری کون اسے سمجھائے
(۲۸)

لالچ ایک انسانی فطرت ہے جس کا ذکر شاعر نے جابجا کیا ہے۔انسان ہمیشہ دنیا حاصل کرنے کی تگ ودو میں رہتا ہے۔شاعر کا خیال ہے کا دنیا کا مال واملاک کسی صورت بھی ساتھ دینے والے نہیں ہے جس طرح خالی ہاتھ تو آیا اسی طرح خالی ہاتھ تمہیں اس جہاں فانی سے کھوج کرنا ہے۔ان کی نظر میں دنیا کے مال متاع کی کوئی وقعت نہیں ہے آج جو چیز میری ہے وہ کل کسی اور کی ہو جائے گی:

دھن دولت کی بھیڑ لگا لے جائے گا کچھ نہ ساتھ
خالی ہاتھ ہی آیا تھا تو جائے گا خالی ہاتھ
(۲۹)

آج اگر یہ میرا تو کل ہوگا تیرا ڈیرا
نہ میرا نہ تیرا پیارے جگ ہے رین بسیرا
(۳۰)

سماجی مسائل

شاعر یا ادیب کسی نہ کسی صورت میں سماج سے وابستہ ہوتا ہے۔ سماج کے اچھے یا بُرے اثرات اس کی تخلیقات پر براہ راست مرتب ہوتے ہیں کیوں کہ ادب زندگی کا عکاس ہوتا ہے۔ ادب میں داخلی اور خارجی عناصر کا مآخذ سماج یا معاشرہ ہوتا ہے۔ جس طرح انسان کا تعلق سماج سے ہے اسی طرح انسانی زندگی کسی خاص علاقے، یا شہر کے ماحول تک محدود نہیں ہوتی۔ بلکہ سارے ملک اور باہر کی دنیا میں جو سیاسی اور سماجی تبدیلیاں جنم لیتی ہیں اُن تمام سے ضرور اثر قبول کر لیتی ہے۔

شاعرؔ صدیقی کے دوہے کا ایک اہم ترین موضوع اُن کا سماجی شعور ہے۔ سماجی شعور کے حوالے شاعرؔ صدیقی کے دوہے میں وسعت پائی جاتی ہے۔ وہ معاشرے میں جنم لینے والے تمام جدید مسائل پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ اس حوالے سے پروفیسر اظہر قادری یوں رقم طراز ہیں:

''ان کے یہاں ایسے اشعار کی کمی نہیں جو اس بات کا واضح پتہ دیتے ہیں کہ انہوں نے سماج کے جدید مسائل اور فکر کے جدید گوشوں کو اپنی تخلیقی کاوشوں کی حصہ بنانے میں اپنی فہم و فراست سے اچھی طرح کام نہ لیا ہو'' (۳۱)

شاعرؔ کے ہاں معاشرتی آگہی کی اصل وجہ یہ ہے کہ جس وقت اُن کی شعری تخلیق عروج پر تھی تو مشرقی پاکستان میں بربادی کے آثار نمودار ہو گئے تھے۔ ایک طرف اگر معاشرہ سیاسی انتشار کے شکنجے میں آ گیا تھا، ہر جانب قتل و غارت گری کا میدان گرم تھا تو دوسری طرف لوگ معاشرتی اور معاشی زوال سے دوچار تھے۔ اس زمانے میں شاعر کی شاعری سقوط ڈھاکہ کے کرب ناک المیے پر ماتم کر رہی ہے اور رومانیت کا غلبہ ان کے اشعار میں معدوم ہو جاتا ہے اور ان کے ہاں ظلم و جبر اور استحصالی رویوں کے خلاف شدید احتجاج نظر آتا ہے۔ اسی طرح جب وہ ہجرت کر کے کراچی میں آ کر قیام پزیر ہوتے ہیں تو یہاں

کی سیاسی درماندگی اور سماجی پستی کی جھلک بھی نمایاں ہے۔ کراچی کی گلی کوچوں میں عام شہریوں کے ساتھ جو سلوک روا رکھا جاتا ہے۔ جس طرح نامعلوم قاتلوں کے ہاتھوں مظلوموں کا خون بہتا ہے۔ شاعر ان سب دل سوز واقعات کا احساس رکھتے ہیں۔ ان حالات پر شاعرؔ کا بیان دیکھئے:

اس نگری سے بھاگ مسافر اس نگری سے بھاگ
بستی بستی شیر چھپے ہیں گلی گلی میں ناگ
(۳۲)

جنگل میں انسان بسے ہیں اور شہروں میں شیر
یہ کیسا اندھیر ہے بابا یہ کیسا اندھیر
(۳۳)

شاعرؔ نے ہمارے سماج کی ہیبت ناک تصویر دکھائی ہے، جہاں کی گلیوں میں انسانوں کے روپ حیوانوں نے بسیرا ڈال دیا ہے۔ جو چند پیسوں کے لیے انسانی زندگی کے دشمن بن جاتے ہیں۔ شاعر نے ایسی خوفناک گلیوں سے مسافروں کو نکل جانے کی تلقین کی ہے کیوں کہ انسانوں کی بستی نے ایک جنگل کا روپ دھار لیا ہے اور وہاں پہ خونخواروں کا دور دورا ہے۔ شاعرؔ مشرقی پاکستان میں گزرے ہوئے دنوں کا ذکر کچھ یوں کرتے ہیں:

تیرے دیس میں ہم پر بیتے ایسی بھی کچھ گھڑیاں
منہ پر تالے، پاؤں میں بیڑی، ہاتھوں میں ہتھ کڑیاں
(۳۴)

اُردو بولنے والے سارے بنگلہ دیش کے باسی
چھوڑو شہر، بساؤ جنگل بن جاؤ سنیاسی
(۳۵)

شاعرؔ صدیقی نے وہ معاشرہ بھی دیکھا تھا جب مشرقی پاکستان میں اُردو بولنے والوں پر زمین کو تنگ کر دیا گیا تھا۔ گرفتاریاں ہو رہی تھی، حق پرستوں کے منہ پر تالے لگائے گئے تھے اور انہیں قید میں ڈالا

جاتا تھا۔شاعرؔ نے بنگلہ دیش میں اُردو بولنے والوں کو براہ راست مخاطب کیا ہے کہ بنگلہ دیش کا یہ معاشرہ چھوڑ دو جہاں تم کو جینے کے حق سے محروم کیا جاتا ہے۔

حقیقت نگاری

شاعر جب اپنے گرد و نواح، معاشرے اور سماج کی سچی تصویر کشی کرتا ہے تو اسے حقیقت نگاری کہتے ہیں۔کلام میں حقیقت نگاری رومانویت کے متصادم ہوتی ہے کیوں کہ اس میں تخلیق کار اپنی شخصیت کے جھروکے سے باہر جھانکتا ہے۔اس میں رومانوی طرز فکر کی طرح خواب و خیال، تصوراتی دنیا اور مافوق الفطرت عناصر کے لیے جگہ نہیں ہوتی بلکہ اس میں باطنی روداد کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔اس میں خارجی حقائق کو منظر عام لانا ہوتا ہے اور زندگی کے مسائل کی ترجمانی ہوتی ہے۔اس ضمن میں ابولاعجاز حفیظ صدیقی یوں رقم طراز ہیں:

> ''ادب میں اشیاء، اشخاص اور واقعات کو کسی قسم کے تعصب، عینیت، موضوعیت اور رومانیت سے آلودہ کیے بغیر دیانت و صداقت کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش حقیت پسندی یا حقیقت نگاری کہلاتی ہے''(۳۶)

حقیقت نگاری کے بیان میں شاعر یا ادیب کے لیے جرأت اور بے باکی کا مظاہر کرنا پڑتا ہے کیوں کہ غیرت جہانِ تگ و دو میں بڑی چیز سمجھی جاتی ہے۔حقائق پر مبنی شاعری زیادہ دیر تک زندہ رہنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔اُردو میں ترقی پسند ادیبوں نے ادب میں حقیقی رجحان کو فروغ دینے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔جس کے نتیجے میں ایسے شعرا منظر عام پر آ گئے جنھوں نے محض اپنی حقیقت پسندانہ جذبات کے بنا پر مقبولیت حاصل کی ہے اور برسوں سے شعرا اور افسانہ نویسوں کے اعصاب پر سے سوار عورت کے تذکرے اُتر گئے۔جس کی بنیاد تخیلاتی اور تصوراتی دنیا پر استوار تھی۔حق گوئی کسی بھی شاعر یا ادیب کا بنیادی وصف ہونا چاہیئے۔اس حق گوئی کا جذبہ اُردو کے بیشتر شاعروں کے ہاں کارفرما ہے۔

عصر حاضر میں شاعرؔ صدیقی بھی اپنی حق گوئی اور بے باکی کے حوالے سے ایک اہم نام ہے۔جبکہ موجودہ دور میں بلند پایہ نقادوں نے اُن کو بطور حق گو تسلیم کیا ہے۔ایک ترقی پسند شاعر ہونے کی حیثیت سے اُن کے کلام پر حقیقت پسندانہ رجحان غالب نظر آتا ہے۔انہوں جو کچھ جس طرح دیکھا اسی طرح بیان

کیا ہے۔خواہ وہ مشرقی پاکستان میں قتل وغارت کی گرم بازاری ہو یا شہر کراچی میں کشت وخون کے بازار میں تڑپتی ہوئی لاشیں، لُٹے ہوئے گھرانے اور نقل مکانی کرتے ہوئے خاندان، تنگ دستی اور غریبی ہو۔ شاعرؔ صدیقی نے کسی بھی حقیقت کو لکھنے سے دریغ نہیں کیا ہے۔اس حوالے سے انور فرہاد لکھتے ہیں:

''شاعرؔ صدیقی طبیعت کے بے حد حساس ہیں۔اپنے اردگرد جو کچھ دیکھتے ہیں اسے شدت سے محسوس کرتے ہیں اور جو کچھ بھی محسوس کرتے ہیں بڑی سچائی کے ساتھ اس کا اظہار کرتے ہیں۔وہ جذبوں کو مصلحت کے سانچے میں ڈال کر پیش کرنے کو شاعری نہیں سمجھتے اور نہ ہی شاعری میں کسی طرح نعرہ بازی کو ضروری تصور کرتے ہیں غالباً یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری ان کے جذبات اور احساسات کی سچی ترجمانی اور صحیح عکاسی کرتی ہے'' (۳۷)

شاعرؔ کے ہاں بڑی پتے کی بات یہ ہے کہ ان کی بے باکی میں رکاکت یا ابتذال نہیں پایا جاتا بلکہ وہ ہر بات میں اخلاق کا مظاہر کرتے ہیں۔اُن کے طنز ونشتریت کے بھی کچھ حدود متعین ہیں۔حالات کے ساتھ ان کی شاعری بھی اپنا رنگ بدلتی رہی ہے۔لیکن سچائی کی تصویر ہر دور میں ان کی شاعری میں جلوہ گر ہے۔انہوں نے یہ بات بھی واضح کردی ہے کہ یہاں سچائی لکھنے والے کے ہاتھ کاٹ دیے جاتے ہیں بلکہ اہل قلم اُن کو گردانا جاتا ہے جنہوں نے سچائی کی ایک سطر بھی نہ لکھی ہو:

سچی باتیں لکھنے والا ہاتھ قلم کروائے
جس نے ایک بھی سطر نہ لکھی اہل قلم کہلائے
(۳۸)

اس دھرتی کی ریت یہی ہے پھر کیسا گھبرانا
سچ کے زہر کا پیالہ پینا اور امر ہو جانا
(۳۹)

شاعرؔ صدیقی سچائی کو زہر کا ایک پیالہ تو سمجھتے ہیں لیکن زہریلے گھونٹ پینے کا درس دیتے ہیں اور سچائی کی راہ میں موت سے نہیں گھبراتے بلکہ وہ سچائی کی راہ میں قتل ہونے کو لازوال زندگی سمجھتے ہیں:

خون پسینہ ایک کرے جو اور اناج اُگائے
اس کے گھر میں بھوک کے کارن کنیا بھی بک جائے
(۴۰)

اپنے گوٹھ کی پیاسی دھرتی بوند بوندھ کو ترسے
اور بادل شہروں میں جاکر راج محل پر برسے
(۴۱)

شاعرؔ صدیقی نے مندرجہ بالا اشعار میں اپنے معاشرے کی ایک تلخ حقیقت کا پردہ فاش کیا ہے۔ جہاں پر کسان اپنا خون پسینہ بہا کر محنت اور مشقت کر کے اناج اُگاتا ہے وہ بھی فاقے کاٹتا ہے۔ ہمارے ملک میں اب بھی کسان بھوک اور افلاس کے سبب اپنی بیٹیاں بیچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ کسان کی محنت کی کمائی جاگیرداروں کی تجوریوں کی زینت بن جاتی ہے۔ جو زمینیں فصل اُگاتی ہے وہ پانی کے بوندھ بوندھ کے لیے ترستی ہے اور بادل شہروں میں جاکر راج محلوں پر برستا ہے۔ یہ ظلم اور استحصال کی روایت اس خطے پر صدیوں سے چلی آرہی ہے۔ جس کا ذکر شاعرؔ نے اپنے کلام میں بھی کیا ہے:

قطعات

اُردو میں رباعی کے بعد قطعہ کو بھی بہت اہم اصناف میں شمار کیا جاتا ہے۔ قطعہ کم از کم دو شعروں کے مجموعے کو کہتے ہیں یا ایسے کچھ اشعار کا مجموعہ جن میں کوئی خیال تسلسل کے ساتھ پیش کیا جائے قطعہ کہلاتا ہے قطعہ کے ہر شعر کے دوسرے مصرعہ میں قافیہ اور ردیف کے ساتھ ساتھ ہیئت کا اہتمام بھی ضروری سمجھا جاتا ہے۔ قطعہ رباعی کی مانند کسی مخصوص بحر کا پابند نہیں بلکہ یہ کسی بھی بحر میں کہا جاسکتا ہے شاعرؔ صدیقی نے بڑی تعداد میں قطعات کہے ہیں جو مختلف موضوعات پر مشتمل ہیں۔ جن میں حمدیہ، نعتیہ اور شخصی قطعات وغیرہ شامل ہیں۔

حمدیہ قطعات

شاعرؔ صدیقی نہایت انکسار، عاجز طبیعت اور مؤدب شخصیت کے مالک ہیں۔ اُن کے ہاں

حمدیہ موضوع نظموں اور غزلوں کے علاوہ رباعیات اور قطعات میں بھی موجود ہے۔ شاعرؔ نے حمدیہ شاعری محض رسمی نہیں کی ہے بلکہ انہوں نے ذات باری تعالیٰ سے اپنی سچی عشق اور محبت کا اظہار نہایت خلوص سے کیا ہے۔ اُن کا یہ رجحان سراسر عشق حقیقی پر مبنی ہے۔ شاعرؔ صدیقی کی حمدیہ شاعری سرتاپا عشق الٰہی میں ڈوبی ہوئی ہے۔ شاعرؔ صدیقی نے حب الٰہی کا اظہار انتہائی شستہ اور پاکیزہ انداز میں کیا ہے جو فصاحت و بلاغت سے معمور ہے۔ وہ ذات باری تعالیٰ سے اپنی بے لوث محبت اور اللہ تعالیٰ کی کبریائی کا اظہار کچھ اس طرح کرتے ہیں:

نہیں معلوم اے مالک تیرا جلوہ کہاں تک ہے
جہاں تک دیکھ سکتی ہی مری نظریں وہاں تک ہے
تیری وسعت کو پانا کیا! سمجھنا بھی ہے ناممکن
مرے دل میں مکیں ہوکر مکاں سے لامکاں تک ہے
(۴۲)

شاعرؔ اللہ تعالیٰ کی عظمت اور برتری کو بے حد سہل و سادہ انداز میں بیان کرتے ہوئے گویا ہیں کہ اے اللہ تعالیٰ تیرا جلوہ ساری کائنات پر محیط ہے۔ بلکہ جہاں تک میری نظریں جاتی وہاں تک تمہاری فطرت چائی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ تیری وسعت کو سمجھنا ناممکن ہے۔ اے اللہ تو میرے دل میں بھی موجود ہے، مکاں اور لامکاں میں بھی۔

شاعرؔ صدیقی کے قطعات میں حمدیہ فکر اتنی دل کش ہے کہ ایک دفعہ پڑھ لینے کے بعد قاری کے دل میں زبانی یاد کرنے حسرت پیدا ہوتی ہے۔ مزید دیکھئے:

موت دیتا ہے رات کو ہر روز
اور پھر صبح زندگی کا مزا
کون قادر اس پہ سوچو تو
ہاں وہی رب ہے، ہاں وہی ہے خدا
(۴۳)

تیری صنّاعی سے انکار کوئی کیسے کرے
اپنی دنیا کو دھنک رنگ بنایا تُو نے
دن کو سورج کے اُجالوں سے کیا ہے روشن
رات کو چاند ستاروں سے سجایا تُو نے
(۴۴)

شاعرؔ صدیقی کو ذات الٰہی پر کامل یقین ہے۔ وہ سمجھتے کہ اس کائنات میں جو تغیرات رونما ہوتے ہیں وہ صرف ایک ہی اللہ کے زیر تصرف ہیں۔ پہلے قطعہ میں شاعر کا اظہارِ حب الٰہی دیدنی ہے۔ وہ بہت انوکھے انداز میں کہتے ہیں کہ کائنات کا نظام چلانے والی ایک ہی ہستی ہے۔ دن کو رات اور رات کو دن میں تبدیل کرنا صرف اللہ کا کام ہے یہ کسی اور کی بس کی بات نہیں ہے لہٰذا وہی اس کائنات کا مالک ہے۔ کوئی انسان اللہ کی صنعت گری کا منحرف نہیں ہوسکتا۔ جس نے کائنات کو حسن دیا۔ دن کو اجالوں سے روشن کیا اور رات کو چاند اور ستاروں سے سجایا۔ اس ضمن میں ایک اور قطعہ ملاحظہ کیجیے:

اے خدا! اے مالک کون و مکاں
حمد تیری کیا کرے کوئی بیاں
تیرے جلوے ہر طرف دیکھو جدھر
تیری الفت تیری رحمتِ بے کراں
(۴۵)

شاعرؔ صدیقی نے مندرجہ بالا قطعہ میں عاجزی اور انکساری کے ساتھ اللہ کی عظمت کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے کہ اللہ کی حمد وثنا بیان کرنا انسان کے دسترس سے باہر ہے۔ ان کو فطرت کے حسن وخوبصورتی میں باری تعالیٰ قدرت نظر آتی ہے۔ وہ جدھر بھی دیکھتا ہے اللہ کے جاہ وجلال ان کی نظروں کے سامنے ہوتا ہے۔ وہ اللہ کے رحم وکرم سے ناامید نہیں ہوئے۔ تخلیق کائنات کے حوالے سے شاعرؔ صدیقی کچھ اس طرح اظہار خیال کرتے ہیں:

جس نے یہ کائنات کی تخلیق
ہاں وہی لائقِ پرستش ہے

پیڑ پودے سبھی ہیں سجدہ کناں
اب بھی شک کی کوئی گنجائش ہے؟
(۴۶)

شاعرؔ صدیقی صرف اُس ہستی کو لائق پرستش گردانتے ہیں جس نے کائنات کی تخلیق کی ہے۔ کائنات کے تمام مخلوقات اللہ کی وحدانیت کا پتہ دیتی ہے۔انہوں نے اس قطعہ میں یہ بھی درس دیا ہے کہ پیڑ اور پودے بھی بارگاہ الٰہی میں سربسجود ہیں اور اللہ کی معبودیت میں شک کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

نعتیہ قطعات

شعرائے کرام نعت شریف میں حضور نبی کریم ﷺ سے اپنی بے لوث محبت اور عقیدت کا اظہار کرتے ہیں۔نعت گوئی کا سلسلہ عربی زبان سے شروع ہوا ہے۔محققین کے مطابق عربی زبان میں میمون بن قیس کو نعت کا اولین شاعر مانا جاتا ہے۔لیکن ہمارے ہاں اُردو ادب میں بھی نعتیہ شاعری کا سرمایہ کافی زیادہ موجود ہیں اُردو کے تقریباً تمام شعرا نے کم یا زیادہ نعتیں ضرور کہی ہیں۔ بلکہ بعض شعرا تو ایسے بھی ہیں جن کا نام صرف نعت گوئی کے حوالے سے مشہور ہو گیا ہے۔

اگر چہ شاعرؔ صدیقی کا اصل میدان غزل اور نظم کا ہے۔اس لیے نعتیہ شاعری ان کے ہاں زیادہ دکھائی نہیں دیتی۔لیکن فکری اور فنی معیار کے لحاظ سے شاعرؔ صدیقی کا یہ قلیل سرمایہ بے مثال ہے۔ان کے نعتوں میں جدت طرازی بھی ہے اور فکر کی بلند پروازی بھی۔ان کی نعتیہ شاعری لفظی اور معنوی خوبیوں سے بھی مالا مال ہے۔وہ ایک سچے عاشق رسول ہونے کی حیثیت سے حضور نبی کریم ﷺ سے بے پنا محبت وعقیدت رکھتے ہیں۔وہ مؤدبانہ انداز میں حضور نبی کریم ﷺ سے اپنی بے مثال محبت کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں:

پیار پھیلاؤ زمانے میں جہاں تک پھیلے
میرے مسلک میں ہے چاہت کا چھپانا معیوب
میں محبت میں رقابت کا نہیں ہوں قائل
جو ہے اللہ کا محبوب ﷺ، وہ میرا محبوب
(۴۷)

اسی دنیا کے دوزخ کو بنانا ہے اگر جنت
تو اے لوگو! رسول اللہ ﷺ کا پیغام کافی ہے
شفاعت کے لیے میدانِ محشر میں میرے شاعرؔ
محمد مصطفیٰ صلّ علیٰ کا نام کافی ہے
(۴۸)

حضور ﷺ سے محبت وعقیدت رکھنے کا تقاضا یہ ہے کہ دنیا میں حضور ﷺ سے پیار ومحبت کا درس دیا جائے اور حضور مبارک ﷺ سے اپنی محبت کا برملا اظہار کیا جائے۔ شاعرؔ صدیقی اسی محبت کو چھپانا معیوب سمجھتا ہے وہ محبت میں رقابت کا قائل نہیں ہے اللہ کے محبوب کو وہ سچے دل سے اپنا محبوب سمجھتے ہیں۔ وہ اس بات پر کامل یقین رکھتے ہیں کہ دنیا اور آخرت کو سنوارنے کے لیے حضور ﷺ کی تعلیمات پر عمل کرنا ناگزیر ہے۔ شاعر کے محبت بھرر لہجے میں حضور ﷺ کے لیے جو سوز اور تڑپ ملتا ہے وہ ان کی اندرونی جذبات کی عکاسی کرتا ہے۔ اس ضمن میں یہ اشعار قابلِ توجہ ہیں:

ایک حسیں خواب جاگتی آنکھیں
دیکھتی ہیں کئی مہینے سے
مجھ کو شاعرؔ بلا رہا ہے کوئی
شہر انوار سے، مدینے سے
(۴۹)

اے خدا وہ زمیں دِکھادے جہاں
روز وشب رحمتیں برستی ہیں
میری پُرشوق و مضطرب آنکھیں
جس کے دیدار کو ترستی ہیں
(۵۰)

شاعرؔ صدیقی نے فکر و تخیل میں اپنی مختلف تمناؤں کا اظہار کیا ہے۔ان کی بے چین اور بے قرار آنکھیں دیدارِ روضہ الرسول ﷺ کے لیے ترس رہی ہیں۔وہ اللہ سے دُعا مانگتے ہیں اور شہرِ انوار میں جانے کے لیے تڑپ رہے ہیں جہاں شب و روز اللہ کی رحمتیں برستی ہے۔

تاجدار کائنات حضور ﷺ تمام مخلوقات کے لیے رحمت بنا کر بھیجے گئے ہیں۔وہ حسن کائنات ہیں۔کل کائنات میں خدا کے بعد اگر کسی کو برتری اور فوقیت حاصل ہے تو وہ آقائے نامدار ﷺ ہیں۔جن کے فیض سے تاریکیوں کے دلدل میں پھنسی ہوئی دنیا امن و آشتی اور محبت کے انوار سے بھر گئی۔شاعر اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں:

آپ ﷺ رحمت بنا کر بھیجے گئے
آپ ﷺ کی شان ہی نرالی ہے
اپنے دیدار سے تو بھر دیجئے
میرا دامن ابھی بھی خالی ہے
(۵۱)

خدا کے بعد اگر کل جہان سے پہلے
مرے حضور کا رتبہ بلند و بالا ہے
اُنہی کے فیض سے روشن یہ چاند سورج ہے
خدا نے نور کے پیکر میں اُن کو ڈھالا
(۵۲)

شاعرؔ صدیقی اپنے قطعات میں حضور ﷺ کی تعریف و توصیف کرتے ہوئے شفاعت کی آس لگاتے ہیں۔ان کے ہاں جذبوں کی طہارت ہے اور عقیدے کی سچائی اور گہرائی ملتی ہے جو نعت گوئی کے لیے جزاوّل سمجھا جاتا ہے۔تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے شاعرؔ نے اپنے پاکیزہ جذبوں کا بھرپور انداز میں اظہار کیا ہے۔انہوں نے فکر و تخیل کے امتزاج سے نئی فضا کو پروان چڑھایا ہے۔ان کے نعتیہ کلام میں بوجھل اور ثقیل الفاظ کا استعمال قطعاً نہیں ملتا بلکہ انھوں نے اپنے کلام کو عام فہم سادہ اور سلیس

بنا یا ہے۔شاعرؔ صدیقی حضورؐ سے جو عشق ومحبت رکھتے ہیں اس کا اندازہ ان کے کلام سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔وہ کسی لحاظ سے بھی اُردو کے دیگر نعت گوشعرا سے کم نہیں معلوم ہوتے۔

شخصی قطعات

شاعرؔ صدیقی کے قطعات میں چند معروف شخصیات کا تذکرہ ملتا ہے جو اپنے عہد میں سچائی، بے باکی، صداقت اور حق گوئی کے حوالے مشہور ومقبول تھے۔اپنی زندگی میں وہ جن اشخاص سے فکر وفن کے لحاظ سے متاثر تھے ان کے متعلق انھوں نے اپنی محبت، عقیدت اور احترام کا اظہار کیا ہے جن سے ان کی وفا اور خلوص کا اندازہ بھی لگایا جاسکتا ہے۔ان شخصیاتمیں اکثریت ان کے قریبی دوست ہیں۔ان میں سے اکثریت کا تعلق مشرقی پاکستان سے ہیں جن سے شاعرؔ صدیقی کے سنہرے دور کی یادیں وابستہ ہیں۔اس دور میں کچھ دوست تو ایسے بھی تھے جنھوں نے شاعرؔ کے ساتھ فریب، دغا اور منافقت کا سلوک روا رکھا جس کا اندازہ ان کے بعض اشعار سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔لیکن یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ سارے دوست ایک جیسے نہیں ہوتے ان میں چند دوست واحباب ایسے بھی تھے جن کی حسین یادیں شاعرؔ کے دل ودماغ پر ہمیشہ کے لیے ثبت ہوگئیں تھیں۔اُن کو اپنے دل میں سمیٹ کر وہ پاکستان چلے آئے۔ایک طرف اگر چہ وہ دوستوں کے منافقانہ سلوک کے گلے، شکوے کرتے ہیں لیکن دوسری جانب وہ اپنے دوستوں کے احترام، محبت، وفا اور حسن سلوک کا بھی معترف ہیں۔شاعرؔ صدیقی نے اپنے عزیز دوستوں کو اپنے اشعار میں ایک منفرد لہجے اور اُسلوب کیساتھ خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

شاعرؔ صدیقی کے قطعات میں ''شخصی قطعات'' کے عنوان سے الگ گوشہ مختص ہے، جس میں رفیع احمد فدائی، نوشاد نوری، رشید الزمان خلشؔ کلکتوی، پروفیسر اظہر قادری اور سوز حیدر آبادی جیسے معروف شخصیات کے فکر وفن کے حوالے سے توصیفی قطعات موجود ہیں۔رفیع احمد فدائی کی تعریف میں لکھتے ہیں:

جو ہیں اہل نظر وہ جانتے ہیں اس حقیقت کو
بہت دشوار ہے بے باک ہونا اک صحافی کا
صحافت ہی پہ کیا موقوف افسانہ نگاری پر
بڑا احسان ہے یارو، رفیع احمد فدائی کا
(۵۳)

نوک قلم سے دل کی گرہ کھولتا رہا
زہر اپنی زندگی میں سدا گھولتا رہا
وہ شخص وہ ادیب فدائی ہے جس کا نام
ہر دور کی تحریر میں سچ بولتا رہا
(۵۴)

حقیقت اور صداقت کی ہمیشہ جستجو رکھنا
تقاضائے ہنر کے آئینے کو روبرو رکھنا
قلم کو بیچنے والے بہت اہل قلم دیکھے
فدائی سے کوئی سیکھے قلم کی آبرو رکھنا
(۵۵)

رفیع احمد فدائی مشرقی پاکستان کے ایک معروف اور حق گو صحافی، افسانہ نگار، مترجم اور ایک بلند پایہ شاعر تھے۔ شاعرؔ صدیقی نے ان کے اوصاف کے بیان میں جس انداز سے کام لیا ہے اس سے رفیع احمد فدائی کی شخصیت کے مخفی گوشے کلی طور پر نمایاں ہو گئے ہیں۔ جس میں ان کی ایمانداری، خوداری، حق گوئی اور بے باکی شامل ہیں جو ایک صحافی کے لیے اپنانا دشوار ترین کام ہوتا ہے۔ لیکن فدائی دل کی باتوں کو نوک قلم پر لاتا رہا اور ہر دور میں سچ بولتا رہا ہے۔ وہ ہمیشہ حقیقت اور صداقت کے راستے پر چلے۔ فدائی کی دیانت داری کا ذکر کرتے ہوئے شاعرؔ نے یہ بات واضح کی ہے کہ میں نے قلم کے بیچنے والے بہت دیکھے ہیں لیکن یہ وہ شخصیت ہے جس نے زندگی بھر قلم کی آبرو کا خیال رکھا ہے۔ شاعرؔ صدیقی اپنے ایک اور دوست رشید الزمان خلشؔ کلکتوی کے حوالے سے یوں رقم طراز ہیں:

آپ کا طرز سخن آپ کا حصہ ہے خلشؔ
فکر و جذبات کی سچائی بیانِ رنگین
اہلِ دل، اہل نظر اہل ہنر یکجا ہیں
پیش کرنے کے لیے آج خراجِ تحسین
(۵۶)

آپ کے اشعار میں ہیں کرب کی پرچھائیاں
فن کی گیرائی میں ہیں افکار کی گہرائیاں
مختصر سی بات کہنا چاہتا ہو میں خلشؔ
آپ کی سچائیاں، جذبات کی سچائیاں
(۵۷)

رشید الزماں کلکتوی شاعرؔ صدیقی کے قریبی دوست اور مشرقی پاکستان کے مشہور شاعر ہیں۔ جنہوں نے بعد میں ہجرت کر کے مغربی پاکستان میں سکونت اختیا کر لی تھی۔ جس کو شاعرؔ صدیقی نے اپنی کتاب ''میرے ہمدم میرے دوست'' میں ''انسان دوست'' شاعر کہا ہے۔ جس کا اندازہ درج بالا اشعار سے بھی کیا جاتا ہے جو شاعرؔ صدیقی نے ان کا مجموعہ غزل ''سچائیاں'' کی رونمائی تقریب کے موقع پر رشید الزماں کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہے تھے۔ ان کی تعریف سے خلشؔ کے کلام فن وفکر گہرائیوں کا اندازہ لگا جاسکتا ہے۔ خلشؔ کی شاعری ان کے فکری جذبات کا آئینہ ہے۔ جس میں کرب کی پرچھائیاں اور جذبات کی سچائیاں بھی ملتی ہیں۔ ایک اور دوست پروفیسر اظہر قادری کو داد وتحسین پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں:

غزلوں کے بادشاہ ہیں نظموں کے تاجدار
میدانِ نقد میں بھی مہارت ہے آپ کا
عصرِ جدید کے بھی ہیں شیدائیوں میں وہ
دورِ قدیم سے بھی عقیدت ہے آپ کو
(۵۸)

نقادِ فن بھی ، ماہر علم عروض بھی
بزمِ سخن میں شوکت محفل کہیں جسے
کیا خوبیاں ہیں حضرتِ اظہرؔ میں کیا کہوں
اک شخص ہے کہ جوہرِ قابل کہیں جسے
(۵۹)

درج بالا اشعار میں شاعرؔ صدیقی نے اپنے دوست اظہرؔ قادری کو ایک زبردست خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ان کی شخصیت کی تمام خوبیاں اجاگر کی ہیں۔شاعرؔ نے ان کو غزلوں اور نظموں کا تاجدار، شوکت محفل اور جوہر قابل جیسے خوبصورت القابات سے نوازا ہیں۔

پروفیسر اظہر قادری کے علاوہ جن شخصیات کا ذکر شاعرؔ صدیقی کے قطعات میں ملتا ہے ان میں معرف شاعر نوشاد نوریؔ اور سوز حیدرآبادی وغیرہ شامل ہیں۔نوشاد نوریؔ شاعرؔ صدیقی کے دوست تھے اور بقول شاعرؔ نہایت خوش طبع انسان تھے۔نوریؔ کی پہلی برسی پر اُنہوں نے دو قطعات کہے تھے جو کلیات میں شامل ہیں۔سوز حیدرآبادی کے حوالے سے ایک قطعہ شامل ہے جو ایک نوجوان شاعر تھے۔جس نے محبت میں ناکامی کے سبب خودکشی کرلی تھی۔جس کا شاعرؔ کو بہت دکھ ہوا تھا چوں کہ ایک طرف تو وہ نوجوان تھے اور دوسری طرف اپنی محبت میں ناکام ہوئے اور محرومیوں سے تنگ ہوکر زندگی کا خاتمہ کردیا تھا۔شاعرؔ صدیقی کہتے یہ وہ زمانہ تھا جس سال انسان نے پہلی مرتبہ چاند پر قدم رکھا تھا۔

سوز و گداز

شاعرؔ صدیقی غم کو اپنا مقدر سمجھ بیٹھے ہیں،اس لیے اُن کی شاعری دُکھ درد اور رنج وغم سے مربوط ہے۔جس چیز نے شاعرؔ کے کلام میں روح ڈال دی ہے۔درد وغم کے عناصر جس طرح ان کی غزل اور نظم میں کثرت سے ملتے ہیں۔اسی طرح یہ داخلی اور خارجی واردات قلبی ان کی دیگر شاعری پر بھی نمایاں ہوئے۔وہ اوروں کا غم بھی اپنا غم سمجھتے ہیں۔سماجی اور سیاسی ہنگاموں نے ان کی رنجش میں مزید اضافہ کیا ہے۔جس کا اثر براہ راست ان کی شاعری پر پڑا۔غم کا احساس اُن کے ہاں ہمیشہ پُر بہار رہا ہے۔اُنہوں نے غم دوراں اور غم جاں کو ایک سانچے میں جس طرح ڈالا ہے وہ داد وتحسین کے لائق ہے۔بعض اشعار یہ پتہ دیتے ہیں کہ مُسرتِ زندگی ان کے لیے محض ایک خواب رہ گئی ہے۔گلشن زیست میں محض خار ان کی قسمت ہے۔زندگی کی نشیب وفراز میں اُنہیں جہاں سانحاتِ درد وغم کا سامنا رہا ہے وہ ان کے قلم سے آنسو کی مانند ٹپکا ہے۔وہ اپنے ہر غم آشکار کرتے چلے جاتے ہیں۔لیکن اس معاملے جس چیز نے شاعر کو بڑا بنادیا ہے وہ ان کی اُمید وبیم ہے۔وہ غم کا شاعر ضرور ہے مگر میرؔ کی طرح ان کا غم یاسیت آمیز نہیں ہے۔

حسیاتی فکریت نے ان کے کلام کو جلا بخشی ہے۔انہوں نے فکر واحساس کو ایک شعری پیکر بخشا

ہے۔کیوں کہ آزادی کے فسادات سے لے کر سقوط ڈھاکا اور پھر کراچی کے ناگفتہ بہ حالات تک کے سانحات ان کی نظروں کے سامنے سے گزرے ہیں۔جس کی وجہ سے شاعرؔ کے کلام میں رنج وغم کے جذبات آمادہ حرکت وعمل ہیں۔شاعرؔ صدیقی کی شاعری میں ان کے دل کی چوٹیں اُبھرتی ہوئی دکھائی دے رہی ہیں۔ان کی شاعری میں جان ڈال دینے والی اہم چیز ان کا اظہارِ غم ہے۔غم ان کی زندگی کا ایک خاص جز بن چکا ہے۔شاعرؔ صدیقی کی زندگی کی ہر گھڑی درد وغم سے لبریز ہے۔اس سلسلے میں شبیر ناقدیوں لکھتے ہیں:

''شاعرؔ صدیقی کے کلام میں حُزنیہ عوامل لازوال اورابدی رنگ میں دکھائی دیتے ہیں۔مسرت شادمانی کے تمام امکانات معدوم نظر آتے ہیں اس پر طرفہ یہ بھی ہے کہ عالمِ ہجراں بھی قیامتِ صغریٰ کا مثل ہے تصورِ یار اتنا راسخ ہو چکا ہے کہ لیل ونہار رتجگوں کی داستان بن گئی ہے اُنہوں نے غمِ ذات اور غمِ جاناں کو انتہائی خوبصورتی سے ایک ساتھ نبھایا۔''(۶۰)

احساسِ غم کا بیان ان کے ہاں ملاحظہ کیجئے:

مسکراہٹ مجھے نصیب نہیں کہاں
میں اسیر غمِ زمانہ ہوں
میں اُڑاتا ہوں اپنے غم کی ہنسی
تم سمجھتے ہو مسکراتا ہوں

(۶۱)

غم ان کی زندگی کا ساتھی ہے اس لیے وہ قدرے یاسیت کا شکار نظر آتے ہیں۔لیکن اس حساسیت میں اُمید کی کرن نظر آتی ہے۔وہ اپنے آپ کو ہمیشہ کے لیے اسیرِ غم تو سمجھتے ہیں مگر خوشی کی آمد سے نااُمید نہیں ہوتے۔وہ غالبؔ کی طرح اپنے غم کی ہنسی اُڑاتے ہیں۔مزید مثالیں دیکھیے:

دل میں ناکام آرزو کا جہاں
قالب یاس و غم میں ڈھلتا ہے

خونِ دل اور خونِ ارماں ہے
زندگی کا چراغ جلتا ہے
(۶۲)

دل تو ویران ہو چکا کب کا
اب بھی روشن ہیں حسرتوں کے یہ داغ
جیسے صحرا میں کھل رہے ہوں گلاب
دشت میں جیسے جل رہے ہوں چراغ
(۶۳)

شاعرؔ کی زندگی کا چراغ ان کے خونِ دل اور خونِ ارماں سے جلتا ہے۔اُن کے دل میں ناکام حسرتوں نے بسیرا کر رکھا ہے۔حسرتوں کے داغ اُن کے دل پر صحرا میں گلاب اور دشت میں چراغ کی مانند روشن ہیں۔

ہجر وفراق

شاعری وسیلہ اظہارِ جذبات،مشاہدات،تجربات اور احساسات ہے۔شاعر کا دل عموماً ہجر وفراق کے کرب واحساس سے خالی نہیں ہوتا۔شاعرؔ صدیقی کے محسوسات میں ایک احساس اُن کا دردِ جدائی بھی ہے جس نے ان کے اشعار میں عناصر رنج والم کو بڑھا دیا ہے۔اس ضمن میں اگر ان کا کلام دیکھا جائے تو لگتا ہے کہ انہوں نے بھی فیضؔ وفرازؔ کی طرح غم دوراں اور غم جاناں کو ایک لڑی پرونے کے ایک کامیاب کوشش کی ہے۔اُنہوں نے محبوب کی جدائی کا درد سہا ہے۔لیکن شاعر کا دردِ ہجر وفراق کی وجہ محض ایک تصوراتی محبوب نہیں ہے بلکہ ایک حقیقت سے دوچار ہے۔اس میں مشرقی پاکستان کی حسین یادیں بھی نمایاں ہیں۔جہاں شاعر نے اپنے شباب کے شب وروز گزارے تھے۔وہ دوست واحباب اور وہ محفلیں جنہیں ہجرت کے وقت شاعر کو چھوڑنا پڑا۔یہ ایک فطری امر ہے کہ جہاں پر انسان کی زندگی اچھی گزری ہو جن جن لوگوں سے واسطہ پڑا ہو وہاں کی یادیں دل پر ضرور نقش ہو جاتی ہیں۔شاعرؔ کی زندگی میں بچپن کے دوستوں کا بچھڑ جانا سب سے بڑا المیہ بن کر سامنے آتا ہے اور یہ کیفیت ان کے لیے بہت دردناک ثابت

ہوتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ اُنہیں زندگی کے لمحہ بہ لمحہ جدائی کا احساس ہوتا ہے۔اپنوں کا بھی اور محبوب کا بھی شاعرؔ صدیقی کا درد جدائی ماضی کی یادوں سے وابستہ۔اُن کی یاد ماضی میں روٹھے ہوسا جن کا عکس جلوہ گر ہے۔شاعرؔ صدیقی کے ہجر وفراق میں چاندنی رات،ٹوٹے ہوئے تارے،شب تنہائی، عارض گلنار پر ڈھلکے ہوئے پرافسانہ شوق جیسے موضوعات کثرت سے موجود ہیں۔وہ پریت کا مارا ہوا ہجر کی تنہائی میں ناصر کاظمی کی طرح بے آواز گلی کوچوں میں گھوم رہے ہیں۔جب اُن کو وصل محبوب میسر نہیں ہوتا تو اُمیدوں کے پھول مرجھا جاتے ہیں۔جدائی کا درد لیے ہوئے شاعر محبوب سے ملنے کی اُمید میں اس کی گلیوں میں آوارہ پھرتا ہے۔ہجر کا درد وغم اُن کے صبح وشام کا ساتھی ہے۔محبوب کی یادیں شاعر کا چین وسکھ زائل کرتی ہے:

دور ہے گو میری نگاہوں سے
پھر بھی تو آس پاس رہتی ہے
پورن ماشی کے چاند میں اکثر
تیری پرچھائیں میں نے دیکھی ہے
(۶۴)

بربط دل کے انہیں ٹوٹے ہوئے تاروں سے
تیری آواز سنی رات کی تنہائی میں
دن کے ہنگامے کسی طور گوارا تھے مگر
چاندنی زہر بنی رات کی تنہائی میں
(۶۵)

شاعرؔ اپنے محبوب کی یاد میں تڑپتا ہے۔وہ محبوب سے مخاطب ہوتے ہوئے کہتا ہے کہ اگر چہ تو میرے نگاہوں سے دور ہے لیکن پھر بھی تو میرے دل میں رہتا ہے۔چاندنی رات میں انہیں وصل یار میسر نہیں ہوتا تو وہ محبوب کا چہرہ چاند میں دیکھتا ہے۔ہر وہ چاندنی رات جو شاعر کے لیے ہجر وفراق پر مبنی ہو زہر کی ایک پیالی کی مانند ہوتی ہے۔ایسا لگتا ہے کہ شاعر نے محبوب کی جدائی کو نہایت گہرائی سے محسوس کیا ہے۔جس چیز نے ان کے دن اور رات کو بوجھل کر دیا ہے وہ ان کی شب جدائی ہے جس میں اُن کو کسی طور بھی قرار نہیں آتا:

فراق یار میں دل سوز نغمہ
کوئی بنسی کی لے پر گا رہا ہے
مجھے محسوس کچھ ہوتا ہے ایسا
مرا ماضی کوئی دہرا رہا ہے
(۶۶)

کوئی ہم دم نہ کوئی ہے دم ساز
بات کیا کیجئے سہاروں کی
دل کی ہر آس ٹوٹ جاتی ہے
جب جھپکتی ہے آنکھ تاروں کی
(۶۷)

یاد آتا ہے وہ منظر تو تڑپ اُٹھتا ہوں
فرط جذبات میں آنکھوں سے چھلکتا کاجل
اور سینے پہ وہ سر رکھ کے کسی کا کہنا
''میں بھلا دوں گی تمھیں تم بھی ہو کتنے پاگل''
(۶۸)

درج بالا قطعات سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کا درد فرقت اُن کی یاد ماضی سے وابستہ ہے۔ جب کوئی فراق یار کا نغمہ گاتا ہے تو اُن کو اپنا ماضی یاد آجاتا ہے۔ شاعر تنہائی کا شکار ہے۔ اُن کے دل کے اُمید کا تارہ ٹوٹ چکا ہے۔ ان کو سہارا دینے کے لیے کوئی دم ساز اور ہمراز نہیں ہے۔ انہیں جب محبوب کی یاد آتی ہے تو ان کا چین وسکون ختم ہوجاتا ہے۔ جدائی کا مضمون اُن کی رباعیات میں بھی کارفرما نظر آتا ہے۔ بطور نمونہ ایک مثال دیکھیے:

پھر آج مجھے یاس و الم نے گھیرا
پھر دل میں کیا آج غموں نے ڈیرا

آ دوست ذرا مجھ کو سہارا دے دے
میں چاہتا ہوں آج سہار تیرا
(۶۹)

شاعر کو ایک مرتبہ پھر یاس والم نے گھیر لیا، غموں نے پھر سے اس کے دل میں بسیر ڈال دیا۔ اسی عالم میں انہیں محبوب کے سہارے کی ضرورت پڑتی ہے محبوب کے غم جدائی نے ان کو ہر حال میں گھیر لیا ہے۔ زندگی کے ہر موڑ پر انہیں جدائی کا احساس ہوتا ہے۔ شاعر کی چاندنی راتیں اور دن کے ہنگامے بھی محبوب کے فراق کے غم سے خالی نہیں ہے۔

رومانیت

ایک رومانی سوچ رکھنے کی بنا پر شاعرؔ صدیقی کے قطعات بھی رومانوی جذبے سے مبرا نہیں ہیں۔ جس میں شاعر نے ایک تصوراتی دنیا آباد کی ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ کریں:

آسماں پر جگمگاتے ہیں ستاروں کے دیے
چاندنی برسا رہا ہے چاند فرشِ خاک پر
اور اس رنگیں فضا میں کون جانے کس لیے
مسکراتا ہوں میں اپنے دیدۂ نمناک پر
(۷۰)

دور ہے گو میری نگاہوں سے
پھر بھی تو آس پاس رہتی ہے
پورن ماشی کے چاند میں اکثر
تیری پرچھائی میں نے دیکھی ہے
(۷۱)

درج بالا قطعات سے ایک بات واضح ہو جاتی ہے کہ شاعر قیود شام سحر اور ہنگامہ زمانہ سے دلبرداشتہ اور اکتایا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ سہانی اور چاندنی رات، ستاروں کی چمک، بلبل کی چہک اور پھولوں

کی مہک میں قرب محبوب کے آرزومند ہے۔وہ رات کی تنہائی اور اندھیروں سے بھی محظوظ نظر آتا ہے کیوں کہ وہ اپنے محبوب کی آمد کی خواہش مند رہتا ہے۔جب شاعر زندگی کی تنگ راہوں میں خود کو اُلجھا ہوا محسوس کرنے لگتا ہے تو اپنی یاد ماضی کی طرف پلٹ جاتے ہیں۔

جب بھی ساون کی رات میں اے دوست
گیت برہا کے کوئی گاتا ہے
مجھ کو محسوس ہوتا ہے جیسے
میرا ماضی پلٹ کے آتا ہے
(۷۲)

بحیثیت ایک کامیاب فلمی گیت نگار رومانیت پسندی کا رجحان اُن کے رگ و پے بسا ہوا ہے۔ یہ رومانوی جذبہ ان کے فنی جوہر کو ابھارنے میں معاون ثابت ہوتا ہوا نظر آتا ہے،جس کی گہری چھاپ اُن کی غزل،نظم،دوہوں اور رباعیات میں بھی نمایاں ہے۔جہاں کہیں اُنہوں نے ذاتی دکھ درد،انقلاب پسندی اور دیگر سماجی مسائل کو جگہ دی ہے وہاں شاعر نے اپنے رومانی جذبے کا بھی بھرم رکھا ہے۔شاعرؔ نے کلاسیکی ادب سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے بھی رومانوی انداز فکر کا دامن تھامے رکھا ہے۔ان کی شاعری کو کلاسیکیت اور رومانیت کا سنگم کہنا بے جا نہ ہوگا۔

راست گوئی

شاعرؔ صدیقی کے قطعات میں حق گوئی کا بھی ایک غالب رجحان رہا ہے چند اشعار دیکھئے جن سے اُن کی حقیقت پسندانہ طرز فکر کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

گل بیچنے والے تھے چمن بیچنے والے
ہم گئے دیوار چمن دوست تھے ہم لوگ
اس جرم کی پاداش میں کیا کیا نہ سہے ظلم
غداروں کی بستی میں وطن دوست تھے ہم لوگ
(۷۳)

کانٹوں کی طرح دل میں کھٹکتے ہیں تمہارے
کس واسطے ہم لوگ یہ جان گئے ہیں
بیچا ہے لہو جس نے رفیقانِ وطن کا
تم لوگ وہی ہو تمہیں پہچان گئے ہیں
(۷۴)

شاعرؔ صدیقی نے اپنے قطعات کے ذریعے وطن کے غداروں کا پردہ بھی فاش کیا ہے۔اُن کے قطعات وطن فروشوں کے خلاف ایک آواز بن گئے ہیں۔جس کی پاداش میں اُنھیں ظلم وستم اور جلاوطنی بھی برداشت کرنی پڑی۔شاعر کہتا ہے کہ غداروں کی اس بستی میں واحد ہم ہی وطن سے محبت کرنے والے موجود تھے۔لیکن یہ حب الوطنی ہمارے حق میں جرم سمجھا گیا۔اُنہوں نے وطن فروشوں پر برملا طنز کیا ہے۔جنہوں نے اُن لوگوں کے خون کا بھی سودا کیا جو رفیقانِ وطن تھے:

ظلم کی پشت پناہی کے لیے
حق و انصاف کو پھانسی دی ہے
قوم اور ملک کے غدّاروں کو
صدر نے عام معافی دی ہے
(۷۵)

شاعرؔ صدیقی نے ان حکمرانوں پر بھی تنقید کی ہے جو ظلم و بربریت کی پشت پناہی کرتے ہوئے حق اور باطل میں امتیاز نہیں کرتے ۔ وہ ملک میں عدل ، انصاف اور مساوات کا گلا گھونٹتے ہوئے اُن لوگوں کو معافی دیتے ہیں جو ملک ،قوم اور امن کے سوداگر ہوتے ہیں۔

شاعرؔ صدیقی کے ہاں ان کی سچائی اور حق گوئی اُن کی شخصیت کی تصویر ہے۔وہ ظلم اور ظالم کا ساتھ کبھی نہیں دیتے۔شاعر کے کلام میں ایسے اشعار میں کافی تعداد میں موجود ہے جن میں معاشرے کی حقیقی صورتیں جلوہ گر ہیں۔اُن کا قلم جرأت اور بے باکی کے ساتھ سچائیاں لکھتا ہے۔حق گوئی کے معاملے میں وہ جان کی قربانی دینے پر آمادہ نظر آتے ہیں۔وہ حق بات کو نظر انداز کرنے کا قائل نہیں ہے۔وہ

راست گوئی میں ذلت ورسوائی کی پروانہیں کرتے۔

قومی تنزل

شاعر کے کلام میں قوم کی بربادی کا درد بھی نمایاں ہے۔قومی تنزل کے بارے میں شاعر کے چند قطعات دیکھئے:

قوم بھٹکی ہوئی ہے سڑکوں پر
سامنے راہبر نہیں آتا
قریہ قریہ میں ڈھونڈ آیا ہوں
کوئی انساں نظر نہیں آتا

(۷۶)

اک اُداسی ہے ہو کا عالم ہے
آنکھیں پُرنم ہیں جس طرف دیکھو
اب درندوں کا راج ہے ہر سو
آدمی کم ہے جس طرف دیکھو

(۷۷)

بھٹکی ہوئی قوم کا دُکھڑا روتے ہوئے شاعر نے قوم کا سب سے بڑا المیہ بیان کیا ہے کہ ہماری قوم رہنمائے حق سے محروم ہے۔قوم کو راستہ دکھانے والا بھی کوئی نہیں ہے۔معاشرہ انتشار کا شکار ہے۔ انسانیت نہ ہونے کے برابر ہے اور قوم پر رہنماؤں کے بجائے درندوں کا راج ہے۔پورے معاشرے پر اُداسی چھائی ہوئی ہے۔انسانیت کہیں پر نظر نہیں آتی۔وہ ملک کی سیاسی صورت حال پر بھی نظر رکھتے ہیں۔جس میں زندگی عام آدمی کے لیے موت،ذلت اور رسوائی بن چکی ہے:

دھرنے، جلسے، جلوس، ہڑتالیں
عہدِ نو کی یہی سیاست ہے

زندگی عام آدمی کے لیے
موت ہے، بے بسی ہے، ذلت ہے
(۷۸)

اس حوالے سے مزید قطعات دیکھئے جو شاعر کی عصری بصیرت کی نمائندگی کرتے ہیں:

کبھی تو سوچو وطن سے اگر محبت ہے
جو راہ تم نے نکالی ہے کیا سیاست ہے
یہ خود کشی، یہ دھماکے، یہ نفرتوں کی زباں
یہ ملک و قوم کی خدمت نہیں عداوت ہے
(۷۹)

خوف و دہشت ہے ہر طرف طاری
جانے کب کسی کی آئے گی باری
اے خدا امن کی کرن دے دے
آج کی رات ہے بہت بھاری
(۸۰)

سماج میں جس چیز کا فقدان وہ حرکت وعمل ہے جس کا اظہار شاعر نے کیا ہے۔ کہ ہم محض گفتار کے غازی بن بیٹے ہیں عملی میدان میں ہماری کوئی کارکردگی نہیں ہے۔ اسلام تعلیمات اور نظام زندگی ہم دوسروں کے لیے پسند تو کرتے ہیں لیکن خود اس پر عمل پیرا نہیں ہوتے۔

شاعرؔ کا کہنا ہے کہ ہمارے معاشرے نے عجیب کروٹ لی ہے۔ ایسی سطح پر آچکا ہے جہاں نہ کوئی طوفان سے ڈرتا اور نہ موجوں سے بلکہ انسان سے انسان خوف کھاتا ہے۔ سماج میں سب سے سستی چیز انسان ہے۔

یاد ماضی

حال سے قطع نظر ذہنی طور پر ماضی کی طرف بڑھنے کو یاد کہتے ہیں۔ فطری طور پر انسان اپنے

بیتے ہوئے دنوں کو یاد کرتا ہے خواں وہ خوشیوں میں گزرے ہو یا غم میں لیکن ماضی کی یادیں انسان پر تڑپا دینے والی کیفیت ضرور طاری کر دیتی ہے۔حال کی نا آسودگی، بے چینی اور تلخیوں سے جب انسان دلبرداشتہ ہو جاتا ہے۔تو وہ ماضی کی رنگینوں اور حسین یادوں میں میں غرق ہونے کی آروز رکھنا شروع کر دیتا ہے۔ماضی پرستی دراصل ایک رمانوی جذبہ ہے جس میں شاعر حال سے فرار اختیار کرتا ہے اور ایک تخیلاتی دنیا آباد کر لیتا ہے۔

شاعرؔ صدیقی چوں کہ ایک رومانی شاعر ہے اس لیے وہ بہت حسین لفظوں میں اپنے ماضی کی یادوں کو دہراتے ہیں اور ان پر آنسو بہاتے ہیں۔وہ زندگی کے حسین لمحات کو بھولنے کے قائل نہیں ہے ان سے شاعر کی خوشی اور غم دونوں وابستہ ہے۔بعض اوقات ایسا لگتا ہے کہ یاد ماضی ان کے لیے ایک عذاب بن گئی ہے کیوں ان کی یادوں میں قوت احساس کا رنگ شامل ہے۔وہ ماضی کی یادوں سے محبت کرتے ہیں۔وہ گزرے ہوئے لمحات کی پرچھائیوں کو غنیمت سمجھتے ہیں۔وہ دل کو بہلاتے ہوئے کہتے ہیں:

مطربہ ہائے کیا کیا تو نے
گیت تھے یا وفا کی تفسیریں
پھر رہی ہیں مری نگاہوں میں
عہد ماضی کی چند تصویریں
(۸۱)

نغمے بے تاب ہیں نکلنے کو
ساز دل کے شکستہ تاروں سے
آج گھبرا رہا ہے جی بے حد
کوئی ماضی کا تذکرہ چھیڑے
(۸۲)

مندرجہ بالا قطعات سے ایسا لگتا ہے کہ شاعرؔ صدیقی کے دل کا سکون اُن کی یاد ماضی کے تذکروں سے وابستہ ہے۔وہ بیتے ہوئے لمحات کو واپس لانے کی خواہش کرتا ہے۔جب وہ مطربہ کی گیت

سنتے ہیں تو عہد ماضی کی حسین تصویریں اُن کی آنکھوں کے سامنے پھر رہی ہیں۔ سازِ دل کے شکستہ تاروں سے اُن کا دل گھبرانے لگا تا ہے۔ اور وہ اپنی ماضی کے تذکرے کو چھیڑنا چاہتا ہے۔ ماضی کی رنگینوں کو یاد کرتے ہوئے مزید کہتے ہیں:

میرا ماضی کہ جذب ہیں اس میں
کتنی رنگینیاں بہاروں کی
اب بھی وہ دن ہیں یاد جب اے دوست
زندگی چھاؤں تھی ستاروں کی
(۸۳)

شاعرؔ صدیقی اپنے ماضی کو یاد کرتے ہیں اور کسی صورت بھی بھولانے کو تیار نہیں۔ اُن کا کہنا اس میں میری زندگی کی رنگینیاں جذب ہیں۔ ماضی کے ساتھ اُن کی ہر خوشی وابستہ ہے جس کو بھولنا گوارا نہیں کرتا۔ گزرے ہوئے دنوں کی ہر یاد ان کے دل نقش ہو چکی ہے۔ جس کو مٹانا اس کے دسترس بالاتر ہو چکا ہے:

عہد رفتہ کو بھلاؤں تو بھلاؤں کیسے
دل پہ جو نقش پڑا اس کو مٹا یا نہ گیا
کوششیں کیں تو بہت ہم نے مگر جانِ جہاں
چاہ کے تم کو کسی اور کو چاہا نہ گیا
(۸۴)

شاعرؔ صدیقی چاہ کر بھی اپنے ماضی کو بھلا نہ سکے۔ کیوں کہ عہدہ رفتہ کی یادیں اُن کے دل و دماغ نہ مٹنے والی تصوریں بن گئیں ہیں۔

اگر چہ اس حوالے سے شاعر کے ہاں ایک تضاد پایا جاتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ماضی کی یادیں اُن کے جینے کا سہارا وہ زندگی کے حسین لمحات کو یاد کیے بنا نہیں رہ سکتا ہے۔ یہ اُن کی زندگی کا وہ حصہ جس کے بل بوتپر اُنہوں نے اپنی زندگی کا سفر جاری رکھا ہے۔

رباعیات

کلیات شاعرؔ صدیقی میں بیس کے قریب رباعیات بھی شامل ہیں۔رباعی کہنا ایک مشکل فن ہے۔لیکن شاعر کے ہاں قطعاً یہ احساس نہیں ہوتا کہ اُن کی رباعیات فن اور معیار سے گری ہوئی ہیں۔ رباعی کے فن سے وہ خوب واقفیت رکھتے ہیں۔لیکن دیگر اصناف کی طرح رباعی کی طرف اُن کا رجحان زیادہ نہیں رہا ہے۔تعداد میں قلیل ہونے کے باجود اُن کی رباعیوں میں فکری بلندی دیکھی جاسکتی ہے۔

خمریات

خمریات سے وہ شاعری مراد لیا جاتا ہے جس میں شراب نوشی یا لوازماتِ شراب اور اوصاف کے متعلق بحث کی گئی ہو مثلاً ساغر وسبو، ساقی و مینا، مے خانہ، میکدہ وغیر اس قبیل کے الفاظ ہیں۔شاعر جب اس قسم کے الفاظ کا ذکر چھیڑتا ہے تو کلام خمریہ شاعری کے زمرے آتا ہے۔لیکن خمریہ شاعری میں ضروری نہیں کہ شراب کا مطلب محض شراب ہی ہو کیوں کہ عموماً شعرا کے ہاں شراب اور اس کے متعلقات کے تذکرے مجاز پر مبنی ہوتے ہیں۔جیسا کہ اقبال نے ''شراب کہن'' معرفت الٰہی کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔ابوالاعجاز حفیظ صدیقی کہتے ہیں:

> ''خمریات یا خمریہ شاعری سے مراد وہ شاعری ہے جس میں شراب اور کے متعلقات کا ذکر ہو'' (۸۵)

اُردو کے تقریباً ہر شاعر کے ہاں خمریات کا کچھ نہ کچھ اظہار ملتا ہے لیکن اس حوالے سرِ فہرست نام ریاض خیرآبادی کا ہے اس کے علاوہ سید عبدالحمید عدمؔ اور جدید شعرا میں جوشؔ ملیح آبادی کا نام بھی مشہور ہے۔ جدیدیت کے ساتھ روایت کی پاسداری کرتے ہوئے اُردو کے دیگر شعرا کی طرح شاعرؔ صدیقی کے اشعار میں بھی شراب کا ذکر جگہ جگہ نمایاں طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔لیکن اس ضمن میں شاعر کی خوبی یہ ہے کہ جوشؔ کی طرح اُن کی طبیعت میں بغاوت کا جذبہ نہیں ملتا۔خمریات کا ذکر ان کی ہاں صرف مجازی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔شاعر صدیقی کی رباعیات میں ساقی، جام، پیمانہ، مستانہ، میخانہ ساغر وصہبا اور مدہوشی جیسے الفاظ تو ملتے ہیں مگر ان الفاظ کا استعمال محض مجاز پر مبنی ہے۔مثلاً اُنہوں نے ساقی

کا لفظ محبوب کے لیے اور ساغر و صہبا محبوب کی آنکھوں اور ہونٹوں کے لیے بہ طور استعارہ استعمال کیا ہے۔ اسی طرح شراب عاشقان کے لیے محبوب کی محبت ہے۔ وہ حقیقت میں شراب نوش نہیں ہیں۔ اُن کے ہاں متعلقات شراب کا ذکر صرف روایتی ہے۔

بعض اوقات جب وہ اپنے محبوب سے محبت کا تقاضا کرتے ہیں تو ساقی کہہ پکارتے ہیں۔ جب وہ ہنگامۂ زمانہ سے دل برداشتہ ہو جاتا ہے تو دردِ دل ہلکا کرنے کے لیے شراب پینے کی آرزو کرتے ہیں لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ خوشی کے عالم میں بھی بادہ کشی کرنے کی خواہش ظاہر کرتے ہیں:

ہر سمت مسرت کی گھٹا چھائی ہے
دنیائے محبت پہ بہار آئی ہے
آ ساقیا ہم کیوں نہ کریں بادہ کشی
کیا عیش کا سامان گھٹا لائی ہے

(۸۶)

پلادے ایک ایسا جام ساقی
کہ میں پھر ہوش میں آنے نہ پاؤں
کبھی میں تھا کسی کا، کوئی میرا
یہ دل آزار باتیں بھول جاؤں

(۸۷)

ہاں رخ سے نقاب آج اُٹھا دے ساقی
ہر ذرّے کو مدہوش بنادے ساقی
ساغر نہیں، صہبا نہیں تو غم کیا ہے
آنکھوں ہی سے اک جام پلا دے ساقی

(۸۸)

شاعر کی مندرجہ بالا رباعیات میں ان کا دورِ شباب جھلکتا ہوا اور اُبھرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

شراب کے نشے میں وہ محبوب کی جدائی کے غم کو بھی بھلانا چاہتا ہے اور خوشی کو بھی دوبالا کرنے کی آرزو رکھتا ہے۔ وہ ساقی کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے کہ انھیں ایسی شراب پلائی جائے کہ ان پر نہ اُترنے والی مدہوشی طاری ہوجائے۔ شاعرؔ صدیقی کے لیے محبوب کی آنکھیں ساغر وصہبا سے کم نہیں ہے۔ جن کو وہ محبوب کی آنکھوں کی مانند سمجھتا ہے۔ اس حوالے سے مزید مثالیں بھی دیدنی ہیں:

پھر کیف و مسرت کا پلا پیمانہ
پیمانہ پلا اور بنا مستانہ
دیتا ہے تجھے دل سے دعا یہ شاعرؔ
ساقی تیرا آباد رہے میخانہ

(۸۹)

آئی نہ مجھے راس محبت ساقی
افسانہ بنی میری حقیقت ساقی
مرنے کی تمنا میں جیے جاتا ہوں
ہستی ہے مری دہر میں عبرت ساقی

(۹۰)

شاعرؔ صدیقی مے نوشی میں کیف وسُرور تلاش کرتے ہیں اور بار بار ساقی سے شراب مانگنے کا تقاضا کرتے ہیں۔ ساقی دراصل شاعر کا محبوب ہوتا ہے جس کو وہ دعا بھی دیتے ہیں کہ ساقی تیرا یہ میخانہ سدا آباد رہے۔

شاعرؔ صدیقی کی شاعری میں خمریات پر مبنی اشعار بکھرے ہوئے ملتے ہیں۔ اُن کے ہاں اس جہت کی بنیاد محض روایتی ہے۔ اس ضمن میں وہ کلاسیکی طرز تحریر اپنائے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن ایسا لگتا ہے کہ وہ آداب مے نوشی سے آگاہ ہیں۔ شاعر صدیقی کی نظموں، غزلوں، قطعات اور رباعیات میں شراب اور اس کے متعلقات کا ذکر ملتا ہے۔ لیکن اس حوالے سے اُنہوں نے جس چیز کا خیال رکھا ہے وہ ان کا اخلاقی معیار ہے۔ اُن کے خمریہ شاعری اخلاق سے گری ہوئی نہیں ہے۔ وہ اخترؔ شیرانی کی طرح شراب

کے نشے میں ہوش وخرد سے بے گانہ نہیں ہوتے۔اُن کی زندگی سوز کی آواز میں ڈوبی ہوئی ہے۔وہ صرف اپنے دل کے بہلاوے کے واسطے شراب، جام، ساقی، صراحی، پیمانہ اور مینا کا ذکر چھیڑتے ہیں۔اُن کے کسی بھی شعر سے یہ بات واضح نہیں ہوتی کہ وہ شراب کے عادی تھے۔ریاض خیرآبادی کی طرح وہ محض شراب کے تذکرے کرتے ہیں۔جس کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔

اخلاقیات

شاعر کی رباعیات میں بھی اخلاقی اقدار کی پاسداری موجود ہے۔اس ضمن میں چند مثالیں قابل دید ہیں۔ملاحظہ کیجئے:

حالات سے انکار بہت کرتے ہیں
خوفِ رسن و دار بہت کرتے ہیں
ہم لوگ کہ گفتار کے غازی بن کر
اسلام کا پرچار بہت کرتے ہیں

(۹۱)

مٹ سکتی ہے تقدیر کی تحریر اگر
کٹ سکتی ہے آلام کی زنجیر اگر
رونے کو میں تیار ہو ایک عمر تلک
رونے سے بدل سکتی ہے تقدیر اگر

(۹۲)

مندرجہ بالا رباعیات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ شاعرؔ صدیقی تماشائے لب بام کے قائل نہیں ہیں۔وہ حرکت وعمل کی تاکید کرتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ ہم کردار کے بجائے گفتار کے غازی ہیں۔ اسلامی اقدار اور تعلیمات ہم ضرور پسند کرتے ہیں لیکن اوروں کے لیے۔حرکت وعمل کی تلقین کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ رونے دھونے سے تقدیریں بدل نہیں جایا کرتی اسی طرح اگر زندگی کی مصائب

وآلام سے نجات حاصل کی جاسکتی تھی تو زندگی بھر رونے کے لیے تیار ہو جائیں۔

باتوں میں زمانے کی نہ آنا ہرگز
اعزازِ محبت نہ گھٹانا ہرگز
چاہت ہے بڑی پاک امانت اے دوست
چاہت پہ کوئی حرف نہ لانا ہرگز

(۹۳)

بے درد زمانے سے شکایت نہ کرو
اس شکل میں توہین محبت نہ کرو
الفت میں مصائب کی فراوانی ہے
الفت میں کبھی خواہش عشرت نہ کرو

(۹۴)

شاعرؔ صدیقی محبت میں بھی پاک دامنی کا درس دیتے ہیں کہ اظہار محبت بھی ایک اخلاقی دائرے میں مقید ہونا چاہیے۔ وہ چاہت کو ایک پاک امانت سمجھتے ہیں۔ اس لیے وہ یہ نامناسب سمجھتے ہیں کہ ہر کسی کے سامنے اس کا ظہار کیا جائے۔ اس سے محبت کے اعزاز میں کمی آتی ہے۔ شاعر کا کہنا ہے کہ ایسے لوگ جو محبت کی اہمیت کو نہیں سمجھتے اس کے سامنے محبت کے تذکرے کرنا توہین محبت ہے۔ محبت میں مشکلات اور تکالیف ہوتی ہیں۔ محبت کرنے والے کو عیش ونشاط کی آرزو نہیں رکھنی چاہیے۔ شاعرؔ صدیقی کے اشعار اخلاقی اقدار شائستگی اور متانت پر مبنی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے اشعار قاری کو کردار وعمل کی طرف مائل کرتے ہیں۔ شاعرؔ صدیقی قناعت، توکل، عجز وانکساری، بردباری، خودداری، مذمت تکبر وغرور، مذمت حرص وطمع جیسی اخلاقی قدروں کے نہ صرف خود حامل ہیں بلکہ کہ دوسروں کو بھی اس کی تلقین کرتے ہیں۔ بقول شاعر علی شاعرؔ:

''جناب شاعرؔ صدیقی با اخلاق، صاحب کردار، ملنسار، ہونے کے ساتھ
ساتھ باوقار شخصیت کے مالک بھی۔ ان کی زندگی کا مطالعہ کرنے سے
معقول ہونے اور کلام پڑھنے سے ان کے معروف ہونے کا ثبوت

ملتا ہے۔ کیوں کہ کسی شخص کا معروف ہونا اہم نہیں ہوتا بلکہ اس کا معقول ہونا بڑی بات ہوتی ہے۔ شاعرؔ صدیقی معروف بھی ہے اور معقول بھی۔'' (۹۵)

شاعرؔ صدیقی چوں کہ ایک فلمی ماحول سے بہت عرصے تک وابستہ رہے ہیں۔ لیکن اس ماحول نے شاعرؔ کے اخلاقی معیار کو نقصان نہیں پہنچایا ہے۔ اُن کا اخلاقی جذبہ ہمیشہ قائم رہا ہے۔ شاعرؔ صدیقی کا کلام اخلاقی عناصر کے حوالے کافی اہمیت کا حامل ہے۔ اُنہوں نے اپنے کلام کو تہذیب و شائستگی کے دائرے میں مقید رکھا ہے۔ وہ غرور، تکبر، خودستائی، لالچ، حرص، عداوت، دنیا پر اعتبار جیسی برائیوں کی ایک پرخلوص انداز میں اصلاح و مذمت کرتے ہیں جو انسانی ذہن میں فطری طور پر پرورش پا رہی ہیں۔ مذکورہ بالا عناصر سے وہ انسان کو باز رکھنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ کہ دنیا کسی صورت میں انسان سے وفا نہیں کرتی لہٰذا یہاں صرف سچائی اور اچھائی کام آتی ہے۔ شاعرؔ صدیقی چوں کہ ایک مخلص انسان ہیں اس لیے انہوں نے ہمیشہ معاشرے کی اصلاح و فلاح کے لیے آواز بلند کی ہے۔

اگرچہ شاعرؔ صدیقی کی رباعیات تعداد کے لحاظ کم ہیں لیکن معیار کے لحاظ سے رباعیات کا یہ محدود سرمایہ اپنے فکری موضوعات کے اعتبار سے کافی اہمیت کا حامل ہے۔

گیت

گیت دراصل ایک ہندی صنف ہے۔ گیت غنائیہ شاعری کی سب سے پسندیدہ صنف سخن تسلیم کی جاتی ہے۔ گیت میں موسیقیت اور شدت جذبات پر زیادہ تر زور دیا جاتا ہے کیوں کہ گیت شاعر کے داخلی کفیات کا مظہر ہوتا ہے۔ موضوعات کے لحاظ سے گیت کا دامن کافی وسیع ہے جس میں عشق و محبت نسوانی کیفیات کے علاوہ زندگی کی دیگر معملات اور معمولات کو با آسانی بیان کیا جا سکتا ہے۔

گیت میں نغمگی اور موسیقیت کے اختلاط سے سراپائے محبوب اور نسوانی حسن کی تصور کشی کی جاتی ہے۔ دیگر اصناف سخن کے مقابلے میں گیت کو یہ اہمیت حاصل ہے کہ یہ صنف عورت کے حسن و دلکشی اور دل آویزی سمانے کی پوری صلاحیت رکھتی ہے۔

اُردو گیت کے حوالے شاعرؔ صدیقی ایک معروف نام ہے۔ اُنھوں نے اُردو کی دوسری اصناف

کی طرح گیت بھی لکھے ہیں اور ایک کامیاب گیت نگار تسلیم ہو چکے ہیں۔انھوں نے اُردو فلموں کے لیے بے شمار گیت بھی لکھے ہیں جو برصغیر پاک و ہند میں چار دانگ مشہور و مقبول ہوئے۔شاعرؔ نے گیت نگاری کا باقاعدہ آغاز مشرقی پاکستان میں قیام کے دوران کیا تھا جب وہ ڈھاکا فلم انڈسٹری سے وابستہ ہو گئے۔اُن کے گیتوں نے ہندوستان اور پاکستان کے کئی گلوکاروں کو شہرت کی بلندیوں سے ہمکنار کیا ہے

شاعرؔ صدیقی نے اپنے جذبات اور احساسات کا گیت میں جس طرح اظہار کیا ہیان میں انسان کی ذات اور فطرت عیاں ہو چکی ہے۔وہ گیتوں میں انسانی جذبات،احساسات اور خواہشات کے ساتھ ساتھ مناظر فطرت کو بھی بڑی مہارت اور خوش اُسلوبی سے بیان کرتے ہیں۔کلیم رحمانی اُن کی گیت نگاری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''گیت کے سلسلے میں یہ کہنا بھی ضروری ہے کہ گیت کا مزاج اور لب لہجے میں نسوانیت اور نسوانی اُمنگوں،آرزوں،فراق،وصل،اور جدائی کا اظہار ملتا ہے،شاعرؔ صدیقی کے گیتوں میں یہ بات نمایاں ہے کہ حسین مناظر فطرت عورت کی بے کلی میں اضافہ کرے ہیں اور وہ اپنی محبوب کی آگ میں لگتی رہتی ہے''(۹۶)

عارف منصور شاعرؔ کے مجموعہ کلام ''آنکھوں میں سمندر'' پر تبصرہ کرتے ہوئے اُن کے گیتوں کے حوالے سے یوں رقم طراز ہیں:

> ''اس مجموعہ کلام میں غزلوں کے علاوہ بہت سی نظمیں،دوہے اور گیت بھی شامل ہیں اور بہت سے گیت وہ ہیں جنہیں صدا نصیب ہو چکی ہے اور اپنے ترنم،طرز ادا اور خوبصورت شاعری کے باعث قبول عام کی سند بھی پا چکے ہیں۔حالاں کہ شاعرؔ نے خود اعتراف کیا ہے کہ گیت اُنہوں نے دھنیں بنائے جانے کے بعد دیئے ہوئے سانچے میں ڈھالے ہیں۔لیکن میرے خیال میں اُنکی شاعری ان پابندیوں میں بھی عمومی نہیں ہوئی''(۹۷)

شاعرؔ کے گیتوں میں وطن سے محبت، نسوانیت، طنز و مزاح اور دیگر سماجی مضامین موجود ہیں۔

نسوانیت

شاعرؔ کے گیت سراپائے محبوب اور نسوانی حسن سے مملو ہیں۔ گیت دراصل نسوانی حسن اور اُمنگوں کے اظہار کا ذریعہ ہے۔ اس لیے رومانی جذبہ شاعر کی فکر پر غالب ہوتا ہے۔ شاعرؔ چوں کہ ایک رومانی شاعر ہیں اس لیے اُن کی گیتوں پر بھی رمانی رنگ کافی گہرا دکھائی دیتا ہے:

تمھیں کھینچ لایا مرا جذبۂ دل
نگاہیں چرا کر گزرنا ہے مشکل
یہ مہتاب عارض، یہ شب تاب گیسو
یہ شرمیلی آنکھوں میں چاہت کا جادو
مہکتے بدن کی یہ سوندھی سی خوشبو
جھکے کیوں نہ سر خوبصورت ہے قاتل
اجازت اگر ہو قدم چوم لوں میں
دھڑکتے ہوئے دل کا پیغام دوں میں
تمھیں میرے محبوب اپنا کہوں میں
تم ہی ہو تم ہی میرے خوابوں کی منزل (۹۸)

شاعرؔ صدیقی اُردو گیت نگاروں میں ایک کامیاب گیت نگار مانے گئے ہیں۔ اُن کا شمار ۱۹۷۱ئسے پہلے سابقہ مشرقی پاکستان کے صف اول کے گیت نگاروں میں ہوتا ہے۔ ان کے گیت اپنے منفرد اسلوب کے بنا پر کافی مشہور و مقبول ہوئے۔ شاعرؔ صدیقی نے فلموں کے لیے ایسے گیت لکھے ہیں جو نور جہاں، فردوسی بیگم، احمد رشدی، عالمگیر اور شہناز بیگم جیسے فنکاروں نے گائے ہیں اور شبنم، ندیم، شبانہ جیسے بڑے اداکاروں پر فلمائے گئے۔ ان گیتوں کا شمار اپنے وقت کے شہرت یافتہ گیتوں میں ہوتا ہے اور آج بھی پسند کیے جاتے ہیں۔ بطور نمونہ ایک مثال دیکھیے جس میں محبوبہ اپنے محبوب کی فرقت میں تڑپتی ہے:

میرے سپنوں میں آ کے، نیندیں چرا کے

دل میرا تڑپاتے ہو
کہو تم مرے کون ہوتے ہو
میری راتوں میں اکثر چاندنی بن کر
سامنے تم آجاتے ہو
جب جب تم کو دیکھتی ہوں میٹھا میٹھا درد جگر میں ہوتا ہے
تم ہی بتاؤ کون ہے جو اپنے دل کا چین خوشی سے کھوتا ہے
میری دھڑکن میں چھپ کے
سانسوں میں بس کے
پیار مجھے سکھلاتے ہو (۹۹)

طنز و مزاح

شاعر کے گیتوں میں عشق و عاشقی کے تذکروں کے ساتھ ساتھ بعض موقعوں پر مزاحیہ عناصر بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اس ضمن میں اخی بیگؔ یوں لکھتے ہیں:

''شاعرؔ صدیقی کے ذخیرے میں عشق و معاشقے کی چھلیں اٹکھیلیاں کرتی ہے۔ طنز و مزاح کے تیر بھی ترکش سے جھانکتے نظر آتے ہیں۔'' (۱۰۰)

گیت کا یہ حصہ دیکھئے:

بھوک انسان کو دیوانہ بنا دیتا ہے
پیٹ کی آگ جوانی کو جلا دیتی ہے
جان من جانِ جگر، خالی پیٹ میرا بھر دے
لے کے آجا، جان تمنا، حلوہ روٹی اور انڈے
بھلا کرے گا خدا تمہارا ہم بھوکے کو کھانا کھلاؤ
لاؤ پراٹھا، شاہی ٹکڑا، مرغ مسلم اور پلاؤ (۱۰۱)

وطن دوستی

شاعرؔ نے شاعری کی جس صنف میں بھی طبع ازمائی کی ہے سب میں وطن سے محبت وعقیدت کا جذبہ ہر جگہ پر پوری شدت کے ساتھ محسوس کیا جاسکتا ہے۔اُنہیں اپنے دیس میں شام کی لالی،سوھنی دھرتی،رنگین فضا، چڑیوں کا چہکنا الغرض ہر موسم پیارا اور سوہانا لگتا ہے۔وطن کی مٹی کا ہر ذرہ اُن کی آنکھوں کا تارا ہے:

اپنے دیس کا ہرایک موسم ہم کو پیار لگتا ہے
لو بھی اچھی لگتی ہے بادل بھی اچھا لگتا ہے

دھرتی سوھنی دھرتی ہے اس دھرتی کی بات نہ پوچھ
اس کی خاک کا ذرہ ذرہ آنکھ کا تارا لگتا ہے

شام کی لالی یوں لگتی ہے جیسے سہاگن کو جوڑا
بھورے سمے چڑیوں کا چہکنا گیت سہانا لگتا ہے

وہ دیکھو سورج کی کرنیں چوم رہی ہیں پربت کو
دھرتی اور آکاش میں کوئی پیار کا رشتہ لگتا ہے
(۱۰۲)

شاعرؔ صدیقی نے اُردو کی مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کرتے ہوئے اپنی فکری وفنی پختگی کا مظاہر کیا ہے۔غزل اورنظم کے بعد انھوں نے اُردوادب کی دیگر مقبول اصناف دوہے،قطعات، رباعیات اور گیتوں کو اپنا وسیلۂ اظہار بنایا ہے۔اُنہوں نے اچھی خاصی تعداد میں دوہے بھی کہے ہیں جو ذاتی کرب کے علاوہ معاشرتی،تہذیبی،اخلاقی،ناصحانہ اور رومانیت جیسے مختلف مضامین کے آئینہ دار ہیں۔ شاعرؔ صدیقی کے قطعات اور رباعیات بھی کثیر الجہت موضوعات پر مبنی ہیں۔اُن کی متفرق شاعری خوبصورت رنگوں کا ایک مرقع ہے اس میں فکروفن اپنی پوری توانائی کے ساتھ دکھائی دیتے ہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆

حوالہ جات

۱۔عطاء الرحمٰن ،نوریؔ، اُردو اصناف ادب،سیفٹی آفیسٹ ، پریس ، مایگاوں، ۲۰۱۶ءص ۱۱

۲۔شاعرؔ صدیقی ،کلیات شاعرؔ صدیقی ، رنگ ادب پبلی کیشنز،کراچی ،اگست ۲۰۱۹ء،ص ۶۷

۳۔ایضاً،ص،۷۵

۴۔ایضاً،ص۷۹

۵۔ایضاً،ص۷۹

۶۔ایضاً،ص۸۰

۷۔ایضاً،ص۸۱

۸۔رفیع الدین ،ہاشمی ،اصناف ادب،سنگ میل پبلی کیشنز ، لاہور، ۲۰۰۸ء،ص ۲۵

۹۔شہزاد احمد،ڈاکٹر ، اُردو نعت پاکستان میں ،حمد ونعت ریسرچ فاونڈیشن ، اُردو بازار ،کراچی،طبع اول،۲۰۱۴ءص ۰۵

۱۰۔شاعرؔ صدیقی ،جگر لخت لخت ، رنگ ادب پبلی کیشنز کراچی، ۲۰۲۱ءص ۵

۱۱۔شاعرؔ صدیقی ،کلیات شاعرؔ صدیقی ، رنگ ادب پبلی کیشنز،کراچی ،اگست ۲۰۱۹ء،ص ۲۸

۱۲۔ایضاً،ص،۸۵

۱۳۔ایضاً،ص۸۶

۱۴۔ایضاً،ص۸۶

۱۵۔ایضاً،ص۱۰۸

۱۶۔ایضاً،ص۸۳

۱۷۔ایضاً،ص۸۴

۱۸۔منصور، عارف، مٹی کا دیا،مشمولہ،،،رنگ ادب،شاعرؔ صدیقی نمبر جولائی تا ستمبر ۲۰۰۶ءص ۱۰۱

۱۹۔شاعرؔ صدیقی ،کلیات شاعرؔ صدیقی ، رنگ ادب پبلی کیشنز،کراچی ،اگست ۲۰۱۹ء،ص ۲۷۷

۲۰۔ایضاً،ص ۲۷۷

۲۱۔ایضاً،ص ۲۷۷

۲۲۔ایضاً،ص ۲۷۷

۲۳۔ایضاً،ص ۲۷۷

۲۴۔ایضاً،ص۳۴۷

۲۵۔ایضاً،ص۳۴۷

۲۶۔ایضاً،ص۳۴۷

۲۷۔ایضاً،ص۳۴۷

۲۸۔ایضاً،ص۳۴۷

۲۹۔ایضاً،ص۳۵۷

۳۰۔ایضاً،ص ۳۵ ۷

۳۱۔اظہر قادری، پروفیسر،مشمولہ،قدیم وجدید کا حسین امتزاج،رنگ ادب،شاعرؔ صدیقی نمبر جولائی تا ستمبر ۲۰۰۶ء ص ۶۵

۳۲۔شاعرؔ صدیقی،کلیات شاعرؔ صدیقی،رنگ ادب پبلی کیشنز،کراچی،اگست ۲۰۱۹ء،ص ۲۳ ۷

۳۳۔ایضاً،ص ۳۳ ۷ ۳۴۔ایضاً،ص ۳۲ ۷

۳۵۔ایضاً،ص ۳۲ ۷

۳۶۔ابوالاعجاز،صدیقیؔ،کشاف تنقیدی اصطلاحات،مقتدرہ قومی زبان،اُردو،اسلام آباد پاکستان،ص ۰ ۷

۳۷۔انور،فرحادؔ،مشمولہ،شاعرؔ صدیقی کی شاعری جذبات کی سچی ترجمانی، رنگ ادب،شاعرؔ صدیقی نمبر جولائی تا ستمبر ۲۰۰۶،ص ۳۷

۳۸۔شاعرؔ صدیقی،کلیات شاعرؔ صدیقی،رنگ ادب پبلی کیشنز،کراچی،اگست ۲۰۱۹ء،ص ۳۳ ۷

۳۹۔ایضاً،ص ۳۴ ۷ ۴۰۔ایضاً،ص ۳۴ ۷

۴۱۔ایضاً،ص ۳۳ ۷

۴۲۔شاعرؔ صدیقی،کلیات شاعرؔ صدیقی،رنگ ادب پبلی کیشنز،کراچی،اگست ۲۰۱۹ء،ص ۳۶ ۷

۴۳۔ایضاً،ص ۳۶ ۷ ۴۴۔ایضاً،ص ۳۶ ۷

۴۵۔ایضاً،ص ۳۷ ۷ ۴۶۔ایضاً،ص ۳۶ ۷

۴۷۔شاعرؔ صدیقی،کلیات شاعرؔ صدیقی،رنگ ادب پبلی کیشنز،کراچی،اگست ۲۰۱۹ء،ص ۳۸ ۷

۴۸۔ایضاً،ص ۳۸ ۷ ۴۹۔ایضاً،ص ۳۸ ۷ ۵۰۔ایضاً،ص ۳۸ ۷

۵۱۔ایضاً،ص ۳۰ ۷ ۵۲۔ایضاً،ص ۳۰ ۷ ۵۳۔ایضاً،ص ۷۹ ۷

۵۴۔ایضاً،ص ۷۹ ۷ ۵۵۔ایضاً،ص ۷۹ ۷ ۵۶۔ایضاً،ص ۸۲ ۷

۵۷۔ایضاً،ص ۲۸ ۷ ۵۸۔ایضاً،ص ۸۳ ۷ ۵۹۔ایضاً،ص ۸۳ ۷

۶۰۔شبیر،ناقدؔ،نقدِفن،رنگ ادب پبلی کیشنز،کراچی پاکستان،ص ۲۰۲

۶۱۔شاعرؔ صدیقی،کلیات شاعرؔ صدیقی،رنگ ادب پبلی کیشنز،کراچی،اگست ۲۰۱۹ء،ص ۴۲ ۷

۶۲۔ایضاً،ص۴۴۷ ۶۳۔ایضاً،ص۴۴۵

۶۴۔شاعرؔ صدیقی،کلیات شاعرؔ صدیقی،رنگ ادب پبلی کیشنز،کراچی،اگست ۲۰۱۹ء،ص۹۲۷

۶۵۔ایضاً،ص۹۲۷ ۶۶۔ایضاً،ص۴۴۷ ۶۷۔ایضاً،ص۴۴۷

۶۸۔ایضاً،ص۴۴۳ ۶۹۔ایضاً،ص۴۴۷ ۷۰۔ایضاً،ص۴۴۷

۷۱۔ایضاً،ص۸۷۷ ۷۲۔ایضاً،ص۸۶۷ ۷۳۔ایضاً،ص۸۸۷

۷۴۔ایضاً،ص۶۰۷ ۷۵۔ایضاً،ص۶۷۷ ۷۶۔ایضاً،ص۶۷۷

۷۷۔ایضاً،ص۷۷۷ ۷۸۔ایضاً،ص۵۷۷ ۷۹۔ایضاً،ص۵۷۷

۸۰۔ایضاً،ص۴۱۷ ۸۱۔ایضاً،ص۸۹۷ ۸۲۔ایضاً،ص۸۹۷

۸۳۔ایضاً،ص۴۶۷ ۸۴۔ایضاً،ص۴۴۷ ۸۵۔ایضاً،ص۵۴۷

۸۶۔ایضاً،ص۶۰۷

۸۷۔ابولاعجاز،صدیقی،کشاف تنقیدی اصطلاحات،مقتدرہ قومی زبان،اُردو،اسلام آباد پاکستان،ص۹۷

۸۸۔شاعرؔ صدیقی،کلیات شاعرؔ صدیقی،رنگ ادب پبلی کیشنز،کراچی،اگست ۲۰۱۹ء،ص۸۵۷

۸۹۔ایضاً،ص۴۴۷ ۹۰۔ایضاً،ص۸۵۷ ۹۱۔ایضاً،ص۸۵۷

۹۲۔ایضاً،ص۵۵۷ ۹۳۔ایضاً،ص۸۹۷ ۹۴۔ایضاً،ص۸۹۷

۹۵۔ایضاً،ص۸۸۷ ۹۶۔ایضاً،ص۸۸۷

۹۷۔شاعرعلی،شاعرؔ،ادرایہ،مشمولہ،رنگ ادب،شاعرؔ صدیقی نمبر جولائی تا ستمبر ۲۰۰۶ء،ص۸

۹۸۔شاعرؔ صدیقی،رنگ ادب شاعرؔ صدیقی نمبر،رنگ ادب پبلی کیشنز کراچی،جولائی تا ستمبر ص ۹۶

۹۹۔شاعرؔ صدیقی،کلیات شاعرؔ صدیقی،رنگ ادب پبلی کیشنز،کراچی،اگست ۲۰۱۹ء،ص۵۰۸

۱۰۰۔ایضاً،ص۵۵۹

۱۰۱۔شاعرؔ صدیقی،جگر لخت لخت،رنگ ادب پبلی کیشنز،کراچی،۲۰۱۲ء،ص۱۱۸

۱۰۲۔شاعرؔ صدیقی،کلیات شاعرؔ صدیقی،رنگ ادب پبلی کیشنز،کراچی،۲۰۱۹ء،ص۵۴۷

☆☆☆☆☆☆☆☆

شاعر صدیقی کا اختصاص

دبستان کراچی کے شعری اُفق پر اُبھرنے والے ادباء وشعرا نے اُردو شعری اور نثری ادب کے سرمایے میں نا قابل فراموش حصہ ڈالا ہے۔ جن میں اُن شعرا کا بھی اہم کردار رہا ہے جنہوں نے برصغیر کے مختلف علاقوں سے ہجرت کر کے سرزمین پاکستان سے اپنی بے لوث محبت کا ثبوت دیا۔ شاعری کے میدان کے شہسواروں میں ایک اہم نام شاعرؔ صدیقی کا بھی ہے جنہوں نے محض ایک صنفِ سخن کو اپنی پہچان نہیں بنایا بلکہ ہر صنف میں خود کو ایک اعلیٰ درجے کا شاعر ثابت کیا ہے۔

شاعرؔ صدیقی کی پرورش کلکتے کے ادبی ماحول میں ہوئی جہاں اُنہیں وطن کے معروف شعرا کی صحبت میں بیٹھنے کا موقعہ ملا اور بہت کم سنی میں شاعری کی طرف مائل ہوئے۔ اُن کے ابتدائی کلام میں ایک پختہ کار سخن ور کے آثار نظر آنے لگے جس کے سبب سے وہ بہت جلد مشہور ہونے کے ساتھ ساتھ مقبول بھی ہوئے اور اُن کی غزلیں مختلف ادبی جرائد میں شائع ہونے لگیں۔ پاکستان بننے کے بعد شاعر نے ۱۹۵۰ء میں کلکتہ سے ڈھاکا ہجرت کی اور یہاں پہ سرکاری ملازمت کے ساتھ صحافت اور فلمی دنیا سے بھی وابستہ ہوگئے۔ یہاں سے اُن کی شاعری کا دوسرا اور سنہرا دور شروع ہوتا ہے اس دور میں اُن کی شاعری فکر وفن کی پختگی کو پہنچی ہے۔ ڈھاکا میں وہ ایک ممتاز شاعر، ادیب اور صحافی کی حیثیت سے مشہور ہوگئے۔ فلم انڈسٹری کے لیے اُنہوں نے جو گیت لکھے وہ چار دانگِ عالم مشہور ہوئے۔ شاعرؔ صدیقی کا شمار ۱۹۷۱ئسے قبل مشرقی پاکستان کے مقبول گیت نگاروں میں ہوتا تھا۔

سانحہ مشرقی پاکستان کے بعد شاعرؔ صدیقی نے اپنے اہل وعیال کے ساتھ نیپال سے ہوتے ہوئے کراچی ہجرت کی جو اُن کی زندگی کا سب سے بڑا سانحہ تھا کیوں کہ گھر بار اجڑنے کے ساتھ ساتھ اُن کا شعری اور نثری سرمایہ بھی اُس سانحہ کی نظر ہوگیا۔ کراچی میں آ کر اُن کا شعری ذوق کئی سال ماند پڑا رہا۔ پھر انھوں نے اس سفر کو نئے سرے سے شروع کرنے کا عہد کیا لیکن اس بار اُن کی فکر اس رومانی فضا سے نکل کر ایک ایسی دنیا سے جڑ گئی جو حقیقت کے قریب تھی۔

شاعرؔ صدیقی کے ہاں بنیادی خوبی یہ ہے کہ وہ معاشرے میں ظلم وتشدد اور ناانصافی کو برداشت کرنے سے قاصر ہیں۔ جہاں بھی معاشرتی شکستگی کو دیکھتے ہیں اس کے خلاف انقلابی نعرہ ضرور بلند کرتے ہیں۔ لیکن اُن کے انقلابی نعروں میں تہذیب اور اخلاقی اقدار کی پاس داری جھلکتی ہے جو اُن کی شخصیت کے

مثبت پہلوؤں کا مظہر سمجھا جاتا ہے۔ اُنہوں نے سچائی کو اپنا مذہب سمجھا ہے۔ لبوں پہ حق بات لانے سے کبھی بھی پیچھے نہیں ہٹتے۔ اس حقیقت پسندانہ رجحان نے شاعرؔ صدیقی کو ماضی کے بعض اکابر شعرا کی صف میں کھڑا کر دیا ہے۔

شاعرؔ کے کلام کی ایک امتیازی خصوصیت یہ بھی ہے کہ اُنہوں نے اپنے عہد کے خارجی اور سماجی مسائل کا بھرپور احاطہ کیا ہے۔ تقسیم ہند و مسلم فسادات سے لے کراچی کے عہد نو کے جدید مسائل کا نوحہ اُن کی شاعری میں ملتا ہے۔ اِن تمام عوامل کے اظہار میں شاعرؔ روایتی انداز کی پاس داری بھی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

شاعرؔ صدیقی کی نظم گوئی کا اگر تجزیہ کیا جائے تو یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ وہ ایک کامیاب نظم گو شاعر بھی ہیں۔ اُن کی نظموں کی تعداد اگرچہ کم ہے لیکن یہ کئی ادوار کے عروج اور زوال کا ایسا آئینہ ہے جس میں اُس عہد کے سماج کے ہر مثبت اور منفی پہلوؤں کو دیکھا جا سکتا ہے۔ شاعرؔ کی نظموں میں موضوعات کا تنوع ہے۔ حمد و نعت کے علاوہ ان میں سقوط ڈھاکا، قومی و ملی، فلسفہ زندگی، اتحاد المسلمین، جنگی، انقلابی، سیاسی اور مناظر فطرت کے علاوہ اور بھی داخلی اور خارجی عناصر دیکھے جا سکتے ہیں۔ شاعرؔ کی نظموں کے موضوعات فکری گہرائی و گیرائی، فکری بہاؤ اور وسعت اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہیں۔ یہ نظمیں اُن کے زرخیز ذہن کا ثبوت ہیں، جبکہ خوش اُسلوبی میں بھی اپنی مثال آپ ہیں۔ وہ نئے مضامین کی تلاش میں اپنے قاری کو اپنے فکر و تخیل کے بہاؤ میں سمیٹ کر ساتھ لے جاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ جس موضوع کو زیر بحث لاتے ہیں وہ اس پر پوری طرح سے علمی گرفت بھی رکھتے ہیں۔ اُن کی نظموں کو پڑھ کر ایسا لگتا ہے کہ اُنہوں نے فیضؔ احمد فیضؔ کی ڈکشن میں توسیع کی ہے تاہم اُن کے ہاں کُلی طور پر تقلید کے آثار نظر نہیں آتے اور نہ یہ احساس ہوتا ہے۔ کیوں کہ اُن کے ہاں تخلیقی جواہر کا فقدان نہیں۔ وہ ہر مضمون کو جذبات کی حدت، احساس کی شدت کے ساتھ فکر و تخیل کی گہرائی میں اُتر کر کہتے ہیں۔ نظم میں جہاں انہوں نے انقلابی اور ملی و قومی نظمیں کہی ہیں وہاں اُن کے جذبے میں روانی اور شدت پائی جاتی ہے۔ جس کا اثر قاری کو گرفت میں لے لیتا ہے۔ اُنھوں نے زندگی کے حقائق کی عکاسی بڑی خوش اُسلوبی سے کی ہے۔ سماجی مسائل پر طنزیہ اظہار اُن کی شاعری میں دیکھا جا سکتا ہے۔ وہ معاشرے میں پھیلنے والی بے اعتدالیوں، ناانصافی اور ظلم و تشدد کو نوکِ قلم پر لانے کے قائل ہیں۔

شاعرؔ صدیقی مشرقی پاکستان میں ایک رومانی شاعرؔ کی حیثیت سے شہرت رکھتے تھے۔ اُس دور

کی تمام تر تخلیقات پر رومانی فکر غالب ہے۔ رومان پسندی شاعرؔ کی فکر کا وہ دریچہ ہے جس سے اُن کی داخلی کفیات و جذبات اور دورِ شباب کو دیکھا جاسکتا ہے۔ اُن کی عشقیہ اور رومانی شاعری فکر ونظر کی بلندی اور تقدس کی متحمل ہے۔

شاعرؔ صدیقی نے کافی تعداد میں دوہے، قطعات اور رباعیات بھی کہی ہیں جن میں فکر وفن کی ہم آہنگی ملتی ہے۔ اُن کے دوہوں میں اخلاقی، مذہبی، معاشرتی، تہذیبی، ناصحانہ، حقیقت نگاری اور عشقیہ مضامین شامل ہیں۔ اُنہیں نظم اور غزل کے ساتھ ساتھ دوہا کہنے پر پورا عبور حاصل ہے۔ دوہا نگاری میں اُن کا انداز دیگر دوہا نگاروں سے مختلف ہے۔ کیوں کہ ان کے دوہے شعری لذت سے لبریز ہیں جس کی تاثیر روح میں اتر جانے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ دوہوں میں شاعرؔ کا اندازِ بیان نہایت سادہ اور دلکش ہے۔ شاعرؔ صدیقی کے دوہوں میں قوم اور مٹی سے محبت کا جذبہ پوری شدت کے ساتھ جلوہ گر ہے۔

شاعرؔ صدیقی نے کافی تعداد میں قطعات بھی لکھے ہیں۔ یہ قطعات بھی متنوع موضوعات پر مشتمل ہیں۔ ان میں حمدیہ اور نعتیہ قطعات کے علاوہ شخصی قطعات بھی شامل ہیں۔ انہوں نے عصری حالات کو بڑی سادگی اور عمدگی سے شعر کے قالب میں ڈھالا ہے۔ زندگی میں وہ جن حالات اور تلخ تجربات سے گزرے ہیں اُنہیں سچائی کے ساتھ اپنے قطعات میں بیان کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے قطعات نے عوامی مقبولیت حاصل کی ہے۔

شاعرؔ صدیقی نے رباعی پر بھی طبع آزمائی کی ہے۔ اُنہوں نے رباعی کی جانب بہت کم توجہ دی ہے۔ قطعات کی طرح رباعیات بھی المیہ مشرقی پاکستان کے پس منظر میں لکھی گئی ہیں۔ جن میں ہجرت کا دکھ درد، اپنوں سے دور ہوجانے کا غم اور دیگر سماجی اور معاشرتی واقعات وحادثات پر مضامین شامل ہیں۔ الغرض شاعرؔ صدیقی کی ہر صنف سخن میں کرب کی آہ وفغاں سنائی دیتی ہے۔ ان عمیق مشاہدات وتجربات نے اُن کی شاعری کو پر تاثیر بنادیا ہے۔ جس کے سبب اُن کا کلام پڑھنے سے دل پر نہ مٹنے والے نقوش ثبت ہوتے ہیں۔

شاعرؔ صدیقی کے تمام شعری اصناف کے فکری وفنی زاویوں سے یہ بات ضرور عیاں ہوجاتی ہے کہ وہ ایک کامیاب اور قدآور شاعر ہیں، کیوں کہ اُنہوں نے جس صنف کو بھی اپنا وسیلہ اظہار بنایا ہے اس میں فکر کی عظمت اور فن کی پختگی واضح طور پر دیکھی جاسکتی ہے۔

شاعرؔ صدیقی کو شہرت سے متصف کردینے والی چیز اُن کی گیت نگاری بھی ہے۔ وہ ۱۹۷۱ء سے

پہلے مشرقی پاکستان کے ممتاز اور کامیاب گیت نگار کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔اس ضمن میں یہاں تک کہا جاسکتا ہے کہ اُن کے بعض گیت ایسے بھی ہیں جنہوں نے شاعرؔ صدیقی سے بھی زیادہ شہرت حاصل کی ہے شاید یہی وجہ ہے کہ اُن کے بعض گیت ایسے ہیں جن کو لوگ جانتے اور سنتے ہیں لیکن کسی کو یہ نہیں معلوم کہ ان گیتوں کے خالق شاعرؔ صدیقی ہیں۔شاعرؔ کے زیادہ تر گیت فلمی گیت ہیں۔اس سبب سے ان گیتوں میں نسوانی جذبوں اور اُمنگوں کا اظہار زیادہ ملتا ہے۔اس کے علاوہ شاعر کے گیتوں میں معاشرتی اور معاشی مسائل کے تذکرے بھی موجود ہیں جو شاعر کی اپنے سماج سے گہری وابستگی کے مظہر ہیں اُنہوں نے یہ مسائل کبھی طنز ومزاح کی صورت میں تو کبھی سنجیدہ انداز میں بیان کیے ہیں۔شاعر وطن کی مٹی سے بے لوث عقیدت رکھتے ہیں جس کی وجہ سے اُن کے گیت بھی حبِ وطن سے خالی نہیں ہیں،جن میں اُنہوں نے دیس کے موسموں،سوھنی دھرتی،شام کی لالی،چڑیوں کے چہکنے،سورج کی کرنوں اور خاک کے ہر ذرّے سے پیار ومحبت کا اظہار کیا ہے۔

ایک طرف اگر شاعرؔ صدیقی نے اپنی شاعری میں فکری جہات کی دنیا آباد کی ہے تو دوسری طرف بہترین اُسلوب وروش اور فن کا دامن بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔شاعرؔ نے اپنے کلام میں فنی تقاضوں کا پورا پورا خیال رکھا ہے۔فنِ شاعری پر انہیں مضبوط گرفت حاصل ہے۔ان تمام فکری رجحانات کو مدنظر رکھتے ہوئے شاعرؔ نے اپنی فنی پختگی کا ثبوت بہم پہنچایا ہے۔جس نے اُن کی شعری تاثیر کو مزید جلا بخشی ہے۔کلام میں سادگی کے ساتھ پختگی بھی ہے۔کہیں اُن کا لہجہ تیز اور کہیں دھیما ہے لیکن جہاں پر اُن کا انداز بیان دھیما وہاں پر اشعار میں غضب کی تاثیر پیدا ہوئی ہے۔کلام میں یہ فن کاری اُن کی شاعرانہ عظمت کی دلیل ہے۔

اہل فن اور معلمین ادب نے شاعرؔ صدیقی کو بنیادی طور پر غزل کا شاعر تسلیم کیا ہے جبکہ بعض نقادوں نے آپ کو ایک کامیاب گیت نگار گردانا ہے۔اس بات سے بڑی حد تک اتفاق کیا جاسکتا ہے کیوں کہ اُن کی شاعری فن وفکر کے ہر معیار پر پوری طرح اُترنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ویسے تو شاعرؔ صدیقی ہر صنف پر پوری قدرت اور گرفت رکھتے ہیں اور کامیاب بھی نظر آتے ہیں لیکن اُن کا اصل میدان غزل ہے۔کیوں کہ دیگر اصناف کے مقابلے میں اُنہوں نے غزل گوئی پر زیادہ توجہ دی ہے۔بلاشبہ شاعرؔ صدیقی کی شاعری میں وہ تمام خصوصیات اور فنی محاسن پائے جاتے ہیں جو شاعری کو ترفع اور بلندی سے ہمکنار کرتے ہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆

کتابیات

بنیادی مآخذ

۲۔شاعرؔ صدیقی،کلیات شاعرؔ صدیقی، رنگ ادب پبلی کیشنز، کراچی، اگست ۲۰۱۹ء

ثانوی مآخذ

انور جمال پروفیسر، ادبی اصطلاحات، طبع سوم، نشنل بک فاونڈیشن اسلام آباد، ۲۰۱۳ء
افتخار احمد خان، ڈاکٹر، اصول تحقیق، شمع بکس پبلشرز، فیصل آباد، س ن
اظہار احمد، ڈاکٹر، اُردو غزل کے کچھ اہم ستون، کراؤن آفیسٹ، سبزی باغ پٹنہ، بھارت، ۱۹۹۶ء
ادریس صدیقی، اردو شاعری کا تنقیدی جائزہ، شیخ سنز، کراچی، ۱۹۸۵ء
اخلاق دہلوی، علامہ، شمیم بلاغت، طبع ثانی، کتب خانہ انجمن ترقی اُردو، جامع مسجد دہلی، ۱۹۶۸ء
ثر مظہری، جدید نظم: حالی سے میرا جی تک، مظہر پبلی کیشن، نئی دہلی، نومبر ۲۰۰۵ء
رفیع الدین، ہاشمی، اصناف ادب، سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۰۸ء
عطاء الرحمن، نوری، اُردو اصناف ادب، سیفٹی آفیسٹ، پریس، مایگاوں، ۲۰۱۶ء
عارف حسن خاں، ڈاکٹر، نصاب بلاغت، جے کے پرنٹرس، دہلی، ۲۰۱۵ء
سلیم، اختر، ڈاکٹر، اُردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۱۳ء
سعد کلیم اللہ، ڈاکٹر، اُردو غزل کی تہذیبی و فکری بنیادیں، گنج شکر پریس، لاہور، ۲۰۱۵ء
ساحل احمد، اردو نظم اور اس کی قسمیں، اردو رائٹرس گلڈ، الہ آباد، ۱۹۹۷ء
سنبل نگار، ڈاکٹر، اردو شاعری کا تنقیدی مطالعہ، دارالنور، لاہور، ۲۰۰۳ء
سید عابد علی، عابد، البیان، طبع اول، زرین آرٹ پریس لاہور، ۱۹۸۹ء
سید عابد علی، عابد البدیع، طبع اول، اظہر سنز پرنٹر، لٹن روڈ، لاہور، ۱۹۸۵ء
سید عبداللہ، ڈاکٹر، ولی سے اقبال تک، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۰ء
شبیر، ناقد، نقد فن، رنگ ادب پبلی کیشنز، کراچی، ۲۰۱۱ء
شہزاد احمد، ڈاکٹر، اُردو نعت پاکستان میں، حمد و نعت ریسرچ فاونڈیشن، اُردو بازار، کراچی، طبع اول، ۲۰۱۴ء
شمس الرحمن فاروقی، اُردو غزل کے اہم موڑ، اصلیہ آفیسٹ پریس، دریا گنج نئی دہلی، بھارت، ۱۹۹۷ء
عفّت زرّیں، ڈاکٹر، جدید غزل، دارالشعور پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۱۵ء
بادت بریلوی، ڈاکٹر، جدید شاعری، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۳۸ء
عبدالباری، مولانا، کلیاتِ نظیر، نول کشور پریس لکھنؤ، ۱۹۵۱ء
عبدالقادر سروری، جدید اردو شاعری، انجمن امداد باہمی مکتبہ ابراہیمیہ، حیدرآباد دکن، ۱۹۳۲ء
غفور شاہ قاسم، پروفیسر، پاکستانی ادب، بک ٹاک، لاہور، ۱۹۹۵ء

فراق گورکھپوری، اُردو غزل گوئی، نصرت بلیشرز، لکھنؤ، بھارت، ۱۹۹۸ء
فرمان، فتح پوری، ڈاکٹر، اُردو رباعی، طبع، دوم، مکتب عالیہ، ایبک روڈ انارکلی، لاہور، ۱۹۳۸ء
طارق ہاشمی، اُردو غزل نئی تشکیل، س، ن
گیان چند، ڈاکٹر، اُردو غزل ہندوستانی ذہن وتہذیب، قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان، نئی دہلی ۲۰۰۲ء
محمد خاں اشرف، ڈاکٹر، رومانیت، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۲ء
محمد عبدالحفیظ، قتیلؔ، ڈاکٹر، معیار غزل۔ اعجاز پرینٹنگ پریس چھتہ بازار حیدرآباد دکن، ۱۹۶۱ء
محمد خاں، اشرف، ڈاکٹر، رومانیت، سنگ میل پبلی کشینز لاہور، ۲۰۱۲ء
محمد عسکری، آئینہ بلاغت، صدیق بک ڈپو لکھنو، بھارت، ۱۹۳۷ء
مزمل حسین، ڈاکٹر، اُردو میں علم بیان اور علم بدیع کے مباحث: تحقیقی وتنقیدی جائزہ، پنجاب یونیورسٹی، ۲۰۰۵

رسائل

تخلیق، ماہنامہ، لاہور اگست ۲۰۰۴ء
رنگ ادب، سہ ماہی، شاعر صدیقی نمبر، کراچی، جولائی تا ستمبر، ۲۰۰۶ء
سرگزشت، ماہنامہ، کراچی، اگست، ۲۰۱۶ء
فنون، سہ ماہی، لاہور، جنوری تا اپریل، ۲۰۰۴ء
فنون، سہ ماہی، لاہور، نومبر تا دسمبر ۲۰۰۴ء
قومی زبان، ماہنامہ، کراچی، اپریل ۲۰۰۴ء

اخبارات

روزنامہ، الاخبار راولپنڈی، ۱۲ فروری، ۲۰۰۴ء

انٹرویو

انٹرویو، شاعرؔ صدیقی، کراچی، ۵ فروری ۲۰۲۰ء
انٹرویو، شاعرؔ صدیقی، کراچی، ۲۹ جولائی، ۲۰۲۰ء

لغات

اثر لکھنوی، "فرہنگ اثر"، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد ۱۹۲۹ء
سید احمد، مولوی، "فرہنگ آصفیہ"، مرتبہ، جلد: 1 تا 4 اردو سائنس بورڈ، لاہور، ۲۰۰۶ء
فیروز الدین، مولوی، "فیروز اللغات"، فیروز سنز، لاہور، ۱۹۷۶ء
نور الحسن، مولوی، "نور اللغات" نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۱۹۷۶ء

☆☆☆☆☆☆☆☆